صنوبر

عفت موہانی

قیمت

ناشر

نسیم بکڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

فون } ۴۴۵۵۹
۴۵۳۳۴

باہتمام نسیم انہونوی (باراول) نظامی پریس لکھنؤ

نیلے رنگ کے مضبوط گیٹ کے سامنے پہونچ کر وہ ٹھٹکا۔ خالہ اسے نجانے کہاں لے آئی تھیں۔ اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا بس ان کے ساتھ چلا آیا تھا۔ ویسے وہ بڑی دیر سے ضبط کر رہا تھا ورنہ جی میں آئی تھی کہ یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایک خالہ ہی کا در تھا آج وہ بھی چھوٹ جائے گا۔ تقدیر اس کے ساتھ چوہے بلی کا سا کھیل کیوں کھیل رہی تھی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اتنی سی عمر میں اسے خاصی سمجھ آگئی تھی۔ یوں بھی مصیبتیں اور پریشانیاں بڑی عمدہ استانیاں ہوتی ہیں۔ وہ بھی بہت کچھ جان گیا تھا مگر اپنی قسمت پر شاکر تھا۔ کبھی اس نے حالات کا شکوہ نہ کیا۔ کبھی مصیبتوں کا رونا نہیں رویا۔ اسے ہمیشہ کسی غیبی مدد اور انوکھے معجزے کا انتظار رہا تھا۔ اچانک کوئی بات ایسی ہو جائے گی کہ وہ جھٹ پٹ کچھ سے کچھ بن جائے گا۔ آخر بہت دنوں پہلے کا وہ الہ دین جسے جادو کا چراغ مل گیا تھا اسی کی عمر کا لڑکا تو تھا۔ تو پھر اب خدانخواستہ ایسا تو نہیں ہوا تھا کہ اللہ میاں مجبور ہو گئے ہوں ویسا چراغ پیدا ہی نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ فرض کیا کہ وہ کسی سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ دفعتہً اسے ایک انگوٹھی پڑی ملتی ہے وہ اسے اٹھا لیتا ہے۔ اور اکیلے میں جا کے کہیں اسے رگڑتا ہے کہ بس کھٹ سے انگوٹھی کا جن سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اب وہ بے چارہ بالکل بوکھلایا ہوا ہے کہ

جن صاحب سے کون کون سی فرمائشیں کرے؟ کھانا مانگے کہ اچھے
کپڑے طلب کرے یا پھر بہت سے نوٹ۔ پتہ نہیں۔ جناب۔ ایسے دشمنوں پر
حواس درست رہنے چاہئیں۔ تب تو کچھ بات بنتی ہے۔ اگر ذرہ برابر بھی بدحواس
ہوئے تو سنا ہے کہ جن خفا ہو کر سر پر آجاتے ہیں۔

اکیلے میں پڑا وہ چپ چاپ سوچا کرتا۔ اگر سچ مچ ایسا ہوگیا تو اسے اپنا دل
مضبوط کرنا پڑے گا۔ سنا ہے کہ بعضے بھیانک ہوتے ہیں بڑی بڑی لال لال
آنکھیں۔ سر پر ایک سینگ، گرجدار آواز ڈراونے قہقہے۔ اگر ان سے آدمی ڈر
جائے تو وہ اسے مار بھی ڈالتے ہیں۔ اور وہ بڑی عقیدت سے آیۃ الکرسی پڑھنے
لگتا ہے خالہ نے کہہ رکھا تھا۔ ہزار دواؤں کی ایک دوا ہے آیۃ الکرسی۔ اب
تو وہ فرفر پڑھنے لگا تھا۔ اسے خاصہ اطمینان بھی تھا۔ جن کبھی اس پر مہربان ہو
گیا تو پیچھے آیۃ الکرسی پڑھی اور اسے مطیع و فرمانبردار بنا لیا۔

خالہ جو خدا جانے اس کی سگی خالہ تھیں بھی کہ نہیں۔ اس کے اس طرح گم صم
رہنے پر بڑے افسوس سے ٹھنڈی سانسیں لیا کرتیں۔ اور اسے (ابھی) سے
الٹے سیدھے خوابوں میں کھویا رہتا ہے نامراد۔ خواب نہ دیکھا کر بچے۔ یہ بہت
دکھ پہونچاتے ہیں۔ ان کی تعبیر کبھی نہیں ملتی۔ مگر اس نے ان کی بات کبھی نہ
مانی۔ خالہ بے چاری بڈھی ہوئیں۔ ان کی ساری زندگی ادھر ادھر کام کرتے
گزر گئی۔ ہمیشہ اپنی مصیبتوں پر سر پیٹا کیں۔ انھوں نے خواب دیکھے ہوتے تو ان
کی لذت بھی جانتیں، خواب کتنا دکھ پہونچاتے ہیں۔ جاگتے کے خواب تو آدمی
اپنی مرضی سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ بھلا کون ہے جو ان پر پہرے بٹھا سکے۔ جو جو
سکھ تقدیر میں نہیں ہوتے مل جاتے ہیں سوتے سوتے اور وہ خالہ کی بے تکی
نصیحتوں کو پیچھے پھینک کر پھر اپنے ذہن میں پھیلے قصر عالیشان میں ایک

مطلق العنان فرمانروا کی طرح گھومنے پھرنے لگتا۔ چھوٹی سی عمر کے خواب بہت بڑے بڑے تھے۔

پھر سچ مچ۔ جیسے کہ نصیب نے کروٹ بدلی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ خالہ کو ان کے بیٹے نے گاؤں بلا لیا تھا۔ کچھ زمینوں کے جھگڑے تھے۔ بٹوارے کا قضیہ تھا۔ جن سے وہ بھی متعلق تھیں۔ پلے کا غذ پر خالہ کا انگوٹھا لگنا تھا۔ وہ بے حد جلدی میں تھیں۔ راتوں رات اپنا ٹوٹا ہوا بکسا نواڑ سے کس کے ٹھیک کر لیا اور اس میں کپڑے ٹھونس کے بند کر دیا۔ ایک بڑا سا گٹھر بھی باندھ لیا تھا اور بس دوسری شام کو نکلنے والی تھیں۔ اس وقت انھیں اس کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اور وہ بڑی حسرت سے انھیں دیکھتا رہا تھا۔ کیا وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گی۔ گاؤں کے ہرے بھرے کھیت، گہرے گہرے کنویں، اور بھرے بھرے کھلیان دیکھنے کا اسے کتنا شوق تھا۔ وہ بھی مخملی گھاس پر ننگے پاؤں دوڑنا چاہتا تھا۔ اسے بھی تازہ گڑ اور لال لال گاجر کھانے کا ارمان تھا مگر اب اس کے یہ سارے ارمان خالہ نے اٹھا کر ایک طرف دھر دیے تھے۔ پوچھا تک نہ تھا کہ وہ بھی آخر چلے گا کہ نہیں۔ وہ خود اتنا صابر، ضابط اور خوددار تھا کہ اپنے منھ سے ان کی رفاقت کا طلبگار ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ خالہ نے اس کی تقدیر تو اپنے سامان میں نہیں باندھ لی تھی۔ وہ اکیلا ہی کچھ کر کے روٹی پیدا کرے گا۔ ایسی بے مروت خالہ سے رحم و کرم کی بھیک نہیں مانگے گا۔

ساری رات وہ سوتا جاگتا رہا۔ اور صبح کو حسب معمول جوار کی روٹی اور گھی میں سوندی ہوئی لال مرچ کی چٹنی کھا کے اس نے گڑ کی ٹگ بھر چائے پی پھر خالہ نے خلاف توقع کہا۔

"اچھا بیٹے۔ اب چل۔ اٹھ۔ میں تجھے بڑے صاحب کے ہاں چھوڑ آؤں۔

بہت اچھے آدمی ہیں۔!"

بڑے صاحب؟" وہ ان کا منھ تکنے لگا۔

"ہاں۔ تیرے خالو انہی کے ہاں کے چوکیدار تھے۔ اتنے فرشتہ آدمی ہیں یہ بڑے صاحب کہ تیرے خالو کے مرنے کے بعد بھی میری پن چن باندھ رکھی ہے۔ آج کل اتنی مروت کون کرتا ہے؟۔ میں نے تیرا تذکرہ کیا تھا ان سے۔ بولے تھے کہ ہاں بیرن بی اگر وہ آپ کا بھانجہ ہے تو ضرور لے آیئے۔ ہمیں بھی چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ایک بچے کی ضرورت ہے۔ وہ اگر ایماندار اور سعادت مند ہوا تو ہم زندگی بھر اسے اپنے پاس رکھ لیں گے۔ سو بیٹا۔ تمھیں بھی ایک ایسے گھر کی ضرورت ہے جہاں سر چھپا سکو۔ اور پیٹ بھر کھا سکو۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ نہیں تو میرے جانے کے بعد کہاں سر ٹکراتے پھرتے!"

خالہ میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔" وہ جی کڑا کر کے بولا۔

سر پلکوں پر لے کے چلتی۔" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔" مگر تم نگوڑے سکندر کو نہیں جانتے بڑے درجے کا اکھڑ، کھرا اور بے مروت ہے۔ تمھیں کبھی کچھ کہہ دے تو دل برا نہ ہو۔ اور یہ بھی تو ہے بیٹا کہ گاؤں کی جگہ سنسان ویران۔ چار ہی روز میں تم گھبرا جاؤ گے۔ مرد عورتیں۔ بچے تین ہی بجے رات سے اٹھ کر کھیتوں پر چلے جاتے ہیں دن کے نکلتے نکلتے تک سارا گاؤں ہُو ہو جاتا ہے۔ تم اس جگہ کھپ نہ سکو گے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ شہر کے پلے بڑھے بچے کو شہر ہی میں چھوڑ جاؤں۔ ارے تم گھبراؤ نہیں۔ بڑے صاحب کے گھر والے بہت اچھے ہیں۔ تمھیں اپنا بچہ سمجھ کے رکھیں گے۔ میں بھی آخر ایک دن آؤں گی۔ کوئی سدا کے لیے بچھڑ نہیں رہی ہوں۔"

اور اس طرح دم دلاسہ دے کر وہ اسے اس جگہ لے آئی تھیں۔ جہاں بڑے

سے نیلے رنگ کے پھاٹک پر رک کر پل بھر کے لیے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور اسے یوں لگا کہ جیسے اس کے سارے خواب جاندار ہو کر اس کے سامنے آ گئے ہوں۔ ایک اطمینان بھری سانس اس کے دل سے نکلی اور لبوں پر سرسرا کر دم توڑ گئی۔

واہ۔ اس نے سوچا ایسا ہی بلند و عریض پھاٹک اس محل کا بھی تھا۔ جس کی گہری بنیادیں اس کے دماغ میں گڑی ہوئی تھیں۔ پھر وہ منہ اٹھا کر خالہ کو دیکھنے لگا۔ ان کے طباق سے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ کہ جیسے سر سے بھاری بوجھ اتار پھینکنے کا خیال انھیں مسرور کر رہا ہو۔

کتنا اچھا گھر ہے" وہ لہرائیں۔ جالیوں سے اندر جھانکو" انھوں نے اسے گردن سے پکڑ کر جالیوں پر جھکا دیا۔

ہاں ہاں" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی لکڑی کی ہی کوٹھری سے نکل کر ادھر آ رہا تھا۔

بیا ہو چوکیدار۔! "خالہ نے کہا۔

پھر اس آدمی کی نظر خالہ پر پڑی ہی تھی کہ کچھ کہے بغیر اس نے گیٹ کھول دیا۔ اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب گھر پر ہیں؟" خالہ نے پوچھا۔

"ہیں!"

آؤ میاں اندر چلیں" خالہ نے اس کی مدقوق سی کلائی اپنے موٹے پنجے میں جکڑی اور بکری کے بے بس بچے کی طرح اسے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگیں۔ بڑی حیرت سے وہ آس پاس دیکھ رہا تھا۔ کیسے عجیب عجیب پیارے پیارے پھول وہاں کھلے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درخت تھے۔ ایک

طرف دیوار میں رخنہ تھا۔ اس میں بھی ایک درخت اُگ رہا تھا۔ اسے شروع ہی سے درختوں سے دلچسپی تھی۔ اپنے ہتھیلی بھر کے آنگن میں بھی اس نے دھنیا گوبھی، مرچ اور پھولوں میں گیندے اور سورج مکھی اگا رکھے تھے۔ دل میں اس نے کہا۔ چلو ٹھیک ہے۔ پودے لگانے اور پھول اگانے کے خوب مزے رہیں گے۔ برسوں کی حسرت پوری ہو جائے گی۔ ہارسنگھار جوہی موگرا، گلاب، اس نے ایک ننھا سا پودا ہارسنگھار کا لگایا بھی تھا۔ جسے خالہ کی جان و جگر مرغیوں نے کرید کر رکھ دیا تھا تب وہ کس قدر رویا تھا یہاں منحوس ماری مرغیاں تو ہرگز نہ ہوں گی۔!

وہ بڑے صاف ستھرے برآمدے میں پہونچے۔

جاتی سردیاں تھیں مگر صبح کی دھوپ ابھی اتنی ناگوار نہیں ہوتی تھی۔ برآمدے میں کئی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک جانب چھوٹا سا تخت تھا۔ جس پر پھولدار دری تھی۔ چھ سات آدمی یہاں وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے تبھی خالہ وہاں نمودار ہو گئیں۔

ارے خالہ میرن۔ ایک لڑکی بولی "یہ آپ اچانک سویرے سویرے کیسے آگئیں۔ آئیے آئیے۔ بیٹھ جائیے۔"

صاحب جی۔ سلام" وہ ایک بزرگ کے سامنے جھک گئیں۔

وعلیکم السلام میرن بی۔!" وہ مسکرائے "تشریف رکھیئے۔ تب اچانک وہ بزرگ اسے بے حد اچھے لگے۔ ان کی نرم آواز کتنی پر محبت تھی۔! وہ خود بھی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ گندمی رنگ، اونچی پیشانی، شفاف متبسم آنکھیں گھنی سیاہ و سفید داڑھی، سفید لباس میں ملبوس وہ بڑے بارعب با وقار ہو رہے تھے۔

اس کے بارے میں کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ وہ سکڑا سمٹا سا خالہ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اور سوچ رہا تھا ان لوگوں نے اسے رکھا پسند نہ کیا تو پھر۔

خالہ کراہتی ہوئی کہہ رہی تھیں "دے دو بی ایک کوپ چائے۔ آپ کے ہاں کی چائے تو جنت سے اتری معلوم ہوتی ہے۔ میں تو نگوڑا ہوٹل کا دھوون پیتی ہوں۔ جس میں نہ مزہ نہ سواد۔ پیسے البتہ دے دو بھر مٹھی اے ہاں ساٹھ پیسے میں ایک کوپ!" خالہ کے اس سفید جھوٹ پر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ کیوں جھوٹ بولی تھیں۔ خوامخواہ جبکہ ابھی کچھ دیر پہلے گڑ کی خوب گاڑھی اور میٹھی چائے جی بھر کے پی کے آئی تھیں۔

ایک لڑکی نے دو پیالیاں ان کی طرف بڑھا دیں۔ اسے چائے پیتے بڑی شرم لگی۔ مگر وہ انکار کیسے کرتا۔ اپنی عادت کے مطابق طشتری میں چائے انڈیلی اور کنکھیوں سے آس پاس دیکھتا ہوا سڑپ سڑپ کرنے لگا۔

اچانک اس کی نظر سامنے اٹھ گئی۔ ایک گوری گوری سی بچی بے حد دلچسپی اور حیرت سے اسے اس طرح پیتے دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کرنل بخشی صاحب کی بچی بھی اسی طرح اسے حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔ اور منہ چڑھایا کرتی تھی۔ اس لیے اس نے منہ بنا کر رخ پھیر لیا۔

اور پھر دفعتاً اس کا تذکرہ درمیان میں آ گیا۔ نجانے وہ کیا کہہ چکی تھیں۔ وہ سن نہ سکا تھا۔ خالہ کی گھگھیائی ہوئی آواز تو چونکنے پر کان میں پڑی تھی۔

"سکندر ہی ہے تو مصیبت ہے صاحب! نہیں تو بالشت بھر کا یہ بچہ مجھے کچھ بھاری نہ تھا۔ اب آپ ہی کرم کیجئے۔ رکھ لیجئے اسے۔ اس دن آپ نے کہا تھا کہ نخرو چلا گیا ہے اور چھوٹے موٹے کاموں کے لیے۔۔۔!"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے"۔ بڑے صاحب نے ان کی لن ترانی میں بریک

لگاتے ہوئے پوچھا: "نام کیا بتایا آپ نے ان کا؟"

"ایاز"

"اچھا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر کھنکارے "آپ مطمئن رہیئے۔ میں اسے رکھے لیتا ہوں۔ اب آپ ماہانہ کے بارے میں۔"

"صاحب وہ کیا" خالہ زیرِ لب پھسپھسائیں "روز کا ایک روپیہ ہی رکھ لیجئے۔ کیا میں آپ سے تنخواہ طلب طے کروں گی سرکار۔!" پھر وہ روہانسی ہو گئیں "سچ کہوں آپ سے حضور۔ اسے اب تک جو پالا پوسا ہے تو مجھ غریب بیوہ پر فاقے گزر گئے۔ دو جانوں ہی کا کھانا پینا میرے لیے بہت تھا۔ سچ جانیے بڑے صاحب میں بی ہمسائی ہی کے دو سو سے اوپر قرضدار ہوں وہ الگ چرچا یا نوچن مچاتی ہیں۔ مطلب یہ سرکار کہ تنخواہ اس بڑے در سے یکمشت مل جاتی تو ہمسائی کا ادھار چکا کر میں باقی سے کرایہ لگا لیتی۔ پھوٹی کوڑی اگر میرے پلے ہو تو سرکار جیسی چاہیں قسم لے لیں۔"

ایک مرتبہ ایاز پھر حیران رہ گیا۔ اسے خالہ سے سخت گھن لگی۔ کیونکہ وہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھیں۔ ابھی پچھلے کل ہی تو انھوں نے ڈاکیے سے پورے سوا سو کا منی آرڈر وصول کیا تھا۔ اور گھر کا پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ بیچ کر بیس پچیس روپے کھرے کیے تھے۔ وہ ساری رقم ان کی تھیلی میں رکھی گریبان میں بند تھیں۔ مگر وہ بے چارہ چپ رہا۔ خالہ نے ہمیشہ تاکید کی تھی۔ جب دو بڑے آدمی بولتے ہوں یا کریں تو خبردار بیچ میں ٹپک ٹیاں کی ... مت بول پڑنا۔ سو وہ چپ چاپ بیٹھا اپنی مول بھاؤ ہوتے سنا کیا۔ بڑے صاحب نے بڑی فراخدلی سے کہا تھا "اچھی بات ہے۔ میں آپ کو یک مشت اس کی سال بھر کی تنخواہ دیے دیتا ہوں۔ آپ کو بھی اطمینان ہو جائے۔ کہ

میں آپ کے بھانجے کو نکالوں گا نہیں۔ ایک خلش مجھے یہ ہے میرن بی کہ آخر سکندر اپنے چھوٹے خالہ زاد بھائی کو اپنے پاس رکھنا کیوں گوارا نہیں کرتا؟"

اب میں کیا بتاؤں سرکار۔" انھوں نے جواب دیا۔

ایاز منتظر تھا کہ وہ کوئی تفصیل سنائیں گی۔ مگر وہ خاموش ہو گئیں۔ اور سرکار نے بھی اپنے سوال کا جواب نہیں مانگا۔ بڑی خاموشی سے خالہ کو دو ہمیں بڑے نوٹ پکڑا دیے جنھیں خالہ نے اپنے کھدر کے کرتے کی جیب میں رکھ لیے۔ اور پھر زمین دوز سلام کرکے اٹھنے لگیں۔

اجازت دیجیے حضور!"

اچھا۔ وعلیکم السلام، خدا حافظ" بڑے سرکار کے اخلاق کا کیا کہنا مسکرا کر ذرا سے سر جھکایا تھا۔ اور بولے تھے۔" لیکن آپ ادھر ہی کی ہو کے نہ رہ جائیے گا۔ ایک آدھ چکر ضرور لگائیے گا!۔

برد بر سرکار" وہ ہنس دیں" موت نہ آ گئی تو میں بھلا یہاں کیسے نہ آؤں گی"۔! پھر وہ ایاز سے بولیں" اچھو۔ سن بیٹا۔ اب یہاں اپنا گھر سمجھ کے رہیو۔ جی لگا کے کام کیجیو۔ سنا؟"

ہاں" اس کا دل بھر آ رہا تھا۔ جانے ان کے جانے کے بعد کیسی گزرے کیسی نہ گزرے!۔ وہ ان کے ساتھ باہر نکلا۔ تب خالہ نے ازراہ مہربانی اسے تیس روپے دیے اور حاتم طائی بن کر بولیں۔

"کچھ کھانے پینے کا دل چاہے تو جی نہ ماریو۔ کھا لیجیو۔" اور پھر اس کی پیشانی کو چوم کر اس کی منھ مانگی تنخواہ دبا کے مزے میں چل دیں۔

دفعتہً اسے یوں لگا جیسے وہ ایک ایسی جگہ کھڑا رہ گیا ہو۔ جہاں نہ سر پر

آسمان ہو نہ پاؤں تلے زمین۔ ہوا میں معلق ہے۔ بڑی دہشت ہوئی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ خالہ نے اسے سال بھر کی پیشگی تنخواہ میں جکڑ دیا تھا۔ سوائے کسی نہ کسی طرح بھگتان بھرنا تھا۔ انھیں خدا حافظ کر کے وہ پھر اندر آ گیا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ پھوٹنے کی دیر تھی، سمندر پلکوں پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اور ضبط کی کوشش میں حلق دکھنے لگی تھی۔

اب برآمدہ خالی تھا۔ وہ حیران سا صحن میں کھڑا تھا۔ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ کیا کسی کو اس انسان نما جانور کی پرواہ نہ تھی۔ جسے ساڑھے تین سو میں انھوں نے خریدا تھا۔

جانے کہاں سے ہنسی مذاق کی اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں غالباً باورچی خانے میں برتن بج رہے تھے۔

وہ نروس ہونے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر سامنے اٹھ گئی اور دل کے لگنے کا سامان ہوتا دکھائی دیا۔ کتنے بہت سے گملے وہاں ایک لمبی قطار میں دور تک رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں اسے کئی سوکھی کلیاں، پژمردہ پھول اور خزاں شدہ زرد زرد پتے نظر آ رہے تھے۔ وہ پاس گیا۔ اور پھر ایک سرے سے سب کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہو گیا۔ جانے کتنا وقت گزر رہا تھا۔ اب جو اس نے سب پر نگاہ دوڑائی تو سارے گملوں کو نئے سرے سے جاندار دیکھا اپنی کامیاب محنت پر وہ مسکرایا۔

"واہ واہ بہت خوب!" ایک پرکشش مردانہ آواز اس نے اپنے پیچھے سنی اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

کوئی صاحب تھے۔ اور تعریفی نظروں سے اس کے کارنامے کو دیکھ رہے تھے۔ ساتھ میں ایک بچی تھی۔ پھولدار لباس میں ملبوس، کتنی پیاری سی

تھی کہ ایاز کی پلکیں جھپک گئیں۔ وہ سہما سہما سا ان صاحب کو تکنے لگا۔
کون ہو تم؟ انھوں نے پوچھا۔ "ہمسائے کے مالی نے بھیجا ہے تمھیں؟"
جی۔ جی نہیں۔ میں۔ میں ایاز ہوں" مٹی بھرے ہاتھ ملتا ہوا وہ ڈرتا
ڈرتا بولا: "آج ہی۔ یہاں نوکر ہوا ہوں"
نوکر؟" وہ بے حد شفقت سے مسکرائے: "نہیں میاں۔ تم نوکر نہیں
ہو۔ مجھے بہت اچھے لگ رہے ہو تم۔ اچھا اب ہاتھ دھو لو۔ میرے ساتھ
چلو۔ یہ گھر وہ کچرا ملازم باہر پھینک آئے گا۔
"ہاتھ کہاں دھوؤں صاحب؟"
ارے بھئی صنوبیہ انھیں غسلخانہ دکھا دو۔ میں باہر بیٹھتا ہوں۔ انھیں
وہیں لے آنا۔!" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔
وہ بچی جو اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی
"چلو نا"۔
وہ اس سے بے حد مرعوب ہوا جا رہا تھا۔ کیا بات تھی اس بچی میں
اتنی سی تو تھی۔ پھر کیا وجہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس لڑکی
سے خوف زدہ کیوں تھا۔ کیا یہ بھی بخشی صاحب کی لڑکی کی طرح منہ چڑھا
کر بھاگے گی۔ اس پر پتھر پھینکے گی؟۔
میری خالہ کے ساتھ تم ہی آئے تھے؟۔ وہ اسے لے کر غسلخانہ میں پہونچی
اور نل کی طرف اشارہ کیا۔
جی ہاں۔!"
"تمھارے ابا اور امی کہاں ہیں؟"
ابا اور امی۔؟" پانی کی موٹی سی دھار اس کے ہاتھوں پر پڑ رہی تھی۔

وہ اچانک بت بن گیا۔ لیکن انہونی سی بات اس نے پوچھ لی تھی۔ وہ تو بھول ہی گیا تھا۔ کیا چیز ہوتا ہے ابا اور کسے کہتے ہیں امّی؟۔

"نہیں" پھر وہ چپکے سے شرمندہ لہجے میں بولا "میں بہت دنوں سے خالہ کے پاس رہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میرے ابا اور امی کہاں ہیں۔

ارے! تم کتنے احمق ہو۔ کیا تم نے خالہ سے بھی نہیں پوچھا؟

نہیں!۔

سنو!"

جی۔ سن رہا ہوں۔

ہماری مالن کے ماں باپ سانپ کے کاٹنے سے مرگئے تھے۔ کہیں تمہارے ماں باپ بھی اسی طرح نہ مر گئے ہوں۔

مر ہی گئے ہوں گے۔ ایاز نے سوچا۔ اگر جیتے ہوتے کم بخت کہیں کے۔ تو اسے مڑ کر نہ پوچھتے؟۔ اب اتنے پتھر تو نہیں ہوں گے۔ اسے اپنے ماں باپ سے بے حد نفرت لگی۔

آپ کے ابا اور امی کہاں ہیں؟" اس نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

"تم سے جو باتیں کر رہے تھے نا۔ وہی تو میرے ابی جی ہیں۔ اور یہ جو میرے ساتھ تھے۔ وہ میرے بڑے بھائی جان ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ ان کی شادی ہوئی تھی تو ہم نے خوب سی مٹھائی کھائی تھی۔ مجھے گلاب جامن اتنے اچھے لگتے ہیں۔ اور میں نے لال لال چمکتے ہوئے کپڑے پہنے تھے۔ تمہارے کپڑے کیسے عجیب ہیں!"

ہاں!" اس نے بڑے دکھ سے اپنے سراپا پر نظریں دوڑائیں۔ میلا

سادھاریدار پاجامہ، اور بادامی رنگ کا قمیص۔ جھولتی ہوئی آستین
گریبان کا اوپر کا بٹن ندارد۔ واہیات سی بدرنگ جوتیاں انگوٹھوں میں
اٹکی ہوئی اسے بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ یہ کپڑے پچھلی عید پر خالہ نے بنوا
دیے تھے۔ دھوتے پہنتے اتنے مہینے گزر گئے۔ کپڑے گھس نہ جاتے تو کیا کرتے!"
اب وہ صنوبیہ کے ساتھ کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھیے کھانے کی کیا
ٹھہرتی ہے۔ پیٹ میں کچھ کچھ قراقر شروع ہو چکی تھی۔ اسے ڈر تھا۔ یہ نا
مانوس آواز کہیں صنوبیہ نہ سن لے!۔

"تم نے ہمارا گھر دیکھا۔ ایاز؟"

ابھی نہیں!۔

چلو پھر دیکھیں! تمھیں پھول اچھے لگتے ہیں!

"جی ہاں۔!"

ارے۔ کیا جی ہاں جی ہاں۔ میں تمھیں اتنی بڑی دکھائی دیتی ہوں کیا
پچھلے دنوں میری آٹھویں سالگرہ ہوئی ہے۔ تم کتنے برس کے ہو؟
خالہ کہہ رہی تھیں کہ میں بارہ برس کا ہوں" اس کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔
ایک لڑکی سے عمر میں بڑا ہونا کتنی شاندار بات تھی۔
کسی نے لڑکی کو آواز دی۔ وہ مسکرائی "لو۔ بھابی آواز دے رہی
ہیں۔ آؤ چلیں۔ تم نے بھابی کے ننھے کو دیکھا؟
ابھی نہیں دیکھا؟" رفتہ رفتہ وہ کھل گیا تھا۔ سال بھر کے لیے پیاسا ہو گیا
تھا۔ کہاں تک آپ داپ کا تکلف۔

سال بھر کا ہے۔ بہت پیارا پیارا سا۔ آؤ دیکھو!

آپ جائیے۔ میں باہر ٹھہرتا ہوں۔

"اچھا"

وہ چلی گئی۔ کہیں سے گھڑی نے دو بجائے۔ اور ایک آدمی کندھے پر جھاڑن ڈالے وہاں آیا۔

"تمھیں ایاز ہو؟"

وہ بے چارہ مؤدب ہو گیا۔ "جی ہاں"

"کھانے کے لیے چلو"

اسے شرم لگی۔ کیسے کھائے گا کھانا سب کے سامنے۔ کھانا اور پیسہ بیحد ذلیل کرنے والی چیزیں ہیں۔ کھانا مانگئے چاہے پیسہ۔ ہاتھ پہلے پھیلانا پڑتا ہے۔ آدمی اپنے مرتبہ سے نیچے گر پڑتا ہے۔ دوسروں کی نگاہوں میں بعد کو اپنی نگاہوں میں پہلے۔

کچن میں سب ملازم کھا رہے تھے ان کے سامنے بھی ایسے کھانے رکھے تھے جو ایاز نے کبھی عمر بھر بھی نہ دیکھے تھے۔ چکھنا تو دور کی بات۔ اس نے شکم سیر ہو کر کھایا پھر اسے چائے دی گئی۔ جس میں خوب سی بالائی پڑی تھی۔ اور چائے کے بعد جھومنے کے بڑی زوردار نیند آئی۔ ایک رکابی میں اپنی انگلیاں گیلی کر کے اس نے قمیص سے ہاتھ پونچھا! اور آستین لبوں پر رگڑی اب تک یہی کرتا آیا تھا۔ پھر کونے میں پڑی چوکی پر ترچھا لیٹ کر دنیا مافیہا سے بے خبر سو گیا۔

نجانے کون سا وقت تھا جب کسی نے اسے جگایا۔ یہاں وہاں چمکدار ٹیوب بلب آن تھے۔ اس نے سوچا کہ دن نکل آیا ہے مگر وہ مغرب تھی کیسا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ دودھیا روشنی، خوشبوئیں، چہل پہل۔ یہ بڑا سا گھر۔ ہنستے ہوئے لوگ۔ صنوبیہ اور سال بھر کا خوب صورت ننھا۔

وہ تو جہاں پہونچ گیا وہ جگہ جنت تھی!

پھر اسے بڑے صاحب نے اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے جانے کیا پوچھتے رہے۔ اسے کیا معلوم تھا۔ کیا بتاتا۔ !وہ پوچھ رہے تھے کہ اب تک وہ خالہ کے ہاں کیا کرتا رہا تھا۔ جواب دیتے اسے نہایت شرم آئی۔ ایسے کہتا کہ کھاتا اور کھیلتا رہا تھا۔ اگر وہ کہیں کہہ دیتا کہ کبڈی اور گلی ڈنڈہ کھیلنے میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یا یہ کہ گولیاں کھیلنے میں وہ ماہر ہو چکا تھا۔ اس طرح ٹھاک سے گولی پر گولی مارتا تھا کہ وہ اڑکر دس گز دور چلی جاتی تھی!

کچھ پڑھے لکھے ہو؟ بڑے بھائی جان نے پوچھا۔

منھ منھ میں بڑبڑاکر اس نے سر جھکا لیا۔

کون پڑھواتا غریب کو۔!" ایک خاتون نے کہا۔ تمہارے ماں باپ تب اس پر خجلت کا دورہ پھر پڑا۔ یہ تھی بے وقوفی۔ اس نے کبھی خالہ سے پوچھا ہی نہ تھا کہ اس کے ماں باپ کہاں تھے۔ تھے بھی کہ نہیں۔ وہ یونہی آسمان سے ٹپک پڑا تھا۔ یہ تو اسے بخوبی علم تھا کہ ہر لڑکے کے ماں باپ ضرور ہوتے ہیں۔ کئی مثالیں اس کے سامنے تھیں۔ اب جیسے کہ روشن کا باپ بھی تھا۔ ماں بھی۔ اس کی سہیلی زاہدہ کے بھی ماں باپ تھے۔ جب وہ گھومتے ہوئے بھیجے میں یہ بات ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ یونہی زمین سے برآمد نہیں ہوا ہے تو ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ تھا۔

"تو پھر میاں تم آخر آئے کہاں سے ہو؟ ضرور تمہارے بھی باپ ماں ہوں گے۔"

اس نے بھائی جان کی آواز سنی۔ "خالہ نے کوئی خاص بات چھپائی ضرور ہے۔ وہ اسے یہاں جھونک گئی ہیں۔ ہر کام میں وہ اپنا فائدہ دیکھتی ہیں خدا جانے اب کون سا فائدہ ان کے پیشِ نظر ہے؟"

"ہوگا" بڑے صاحب کی بیگم جو بے حد محبت والی لگ رہی تھیں، بولیں "کسی کے نفع نقصان سے ہمیں کیا واسطہ۔ یہ بے چارہ بچہ ہم پر کون سا بوجھ ہے۔ اگر یہ بھاگے نہیں تو عمر بھر گھر کا ایک فرد بن کر رہے گا۔ مجھے تو غریب کی شکل دیکھ کر رحم آ رہا ہے۔ جانے کون موئے گنہگار ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد کو یوں ایرے غیرے کے حوالے کرکے پاپ سر سے اتارتے ہیں۔ خدا کا خوف نہیں کرتے۔ مزے میں لگوڑے دندناتے ہیں۔!"

دن تو جیسے تیسے گزر گیا۔ بڑے مزے میں گزرا۔ رات آئی سر پر بلا آگئی۔ اسے ایک کمرہ دیا گیا تھا۔ جس میں دیوار سے لگی مسہری بچھی تھی۔ ایک طرف جو حصہ فرش کا کھلا تھا وہاں قالین کا ٹکڑا بچھا تھا۔ بڑے دروازے کو کھولنے سے سامنے باغ نظر آتا تھا اور دروازے کے سامنے گھومتا ہوا برآمدہ تھا! اس نے دیکھا کہ چھت میں پنکھا بھی اٹکا ہوا تھا یہ دیکھ دیکھ کر اس کے ہوش گم ہوئے جا رہے تھے۔ کیا یہ سچ مچ اس کا کمرہ تھا۔ اب تک تو وہ ایک کچے سے کمرے میں خالہ سے لپٹ کر سو جاتا تھا اور کیا نام کہ کچھ ڈر لگے۔ لیکن یہاں۔ جب وہ کمرے میں آیا تب لرز رہا تھا۔ کیسے کٹے گی یہ رات۔ اکیلے سوتے کلیجہ نکلا آ رہا تھا۔

دس بجتے بجتے سب اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے۔ اور اسے ایک ملازم یہاں چھوڑ گیا۔ اس کا دن جتنا خوبصورت تھا۔ رات

اتنی ہی ڈراؤنی۔ باغ میں ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ اونچے اونچے درختوں میں جب ہوا گھستی تو وہ عجیب آواز سے جھومتے تھے۔ وہ بستر پر بیٹھا سسکیاں لے رہا تھا۔ کیا کرے کہاں جائے۔ بڑا دل مضبوط کرکے اس نے سونے کی کوشش کی۔ کمبل سے خود کو ڈھانپ کر لیٹا اور تکیے میں منہ چھپا لیا۔ مگر خالہ کے نرم گرم دھڑکتے سینے کی بات کہاں۔ اچانک درخت پھڑپھڑا کر جھکے اور سیدھے ہوئے وہ بھی چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ اب تھر تھر کانپ رہا تھا!

اس سے سویا نہ گیا وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یہاں وہاں سب سناٹا تھا صحن میں پیاری سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دالان میں اندھیرا تاریکی اور سب دروازے بند۔

سہ پہر کو صنوبیہ نے اسے اپنا گھر دکھا دیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کس کا کمرہ کون سا ہے۔ اس نے بیگم صاحبہ کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر سسکیاں ہچکیاں لینی شروع کر دیں!۔

تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ بیگم صاحبہ باہر نکلیں۔ اور اسے بیٹھا روتا دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔

"ارے تم ہو ایاز۔ کیا ہوا کیا بات ہے؟ ڈر گئے کسی چیز سے؟" وہ بے حد ہمدردی اور محبت سے پوچھ رہی تھیں۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ گالوں پر موٹے موٹے قطرے ڈھلک رہے تھے ہونٹ ٹیڑھے ترچھے ہو رہے تھے۔ ان کے پوچھنے پر بڑی مشکل سے بول سکا۔

"آپ کے باغ سے۔ ڈراؤنی اور بھیانک آوازیں آ رہی ہیں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ ڈر لگ رہا ہے!۔"

"سچ تو ہے۔" انھوں نے کہا۔ "وہ پرانا دیوان خانہ اس چھوٹے سے لڑکے کے رہنے کی جگہ تھوڑی ہی ہے۔ ڈرے نہیں تو بے چارہ کیا کرے۔" انھوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھا لیا۔ "آؤ۔ تم میرے کمرے میں سو رہو! ۔ کل میں دوسرا کمرہ صاف کروا دوں گی!"

وہ اندر گیا۔ لیکن خوابناک نیلی نیلی ٹھنڈی روشنی کمرے میں پھیلی تھی۔ ایک بڑی سی مسہری پر صنوبیہ آرام سے سو رہی تھی۔ اس کا سفید چہرہ نیلی روشنی میں چمکتا ہوا الگ رہا تھا!۔

لے بیٹا۔ لیٹ کے سو رہو یہاں۔ بیگم نے مسکرا کر کہا اور اپنی نماز کی چوکی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر جانماز اور دری لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی۔ جب وہ آرام سے چوکی پر لیٹ گیا تب انھوں نے کوئی شال اسے اڑھا دی اور خود اپنی مسہری کی طرف بڑھ گئیں۔

یہاں سکون واطمینان تھا۔ آج دن بھر کے انقلاب کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی پلکیں جھپکنے لگیں اور تھوڑی دیر بعد وہ بےخبر ہو گیا۔!!

اگر چھوٹے سے ذہن کی کوئی قیمت تھی تو یہیں تھی! چند ہی دنوں میں ایاز کی کایا پلٹ گئی۔ بڑے سرکار نے اسے کپڑے بنوا دیے تھے کوئی بھی اس سے ٹکا دینے والے کام نہیں لیتا تھا۔ اسے باغبانی سے بے حد دلچسپی تھی۔ صبح سے شام تک وہ مختصر سے باغ کی چمن بندی

میں لگا رہتا۔ یا پھر بھابی کے بچے کو لادے لادے پھرا کرتا۔ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر میں چلا آیا تھا۔ اور اب نہ اسے اپنے لاپتہ ماں باپ کی فکر تھی نہ خالہ یاد تھیں۔ وہ ہر طرح مگن تھا۔ خالہ نے پھر اس کی خیر خبر ہی نہ لی اسے ان کی پروا بھی نہ تھی!۔

تھوڑے ہی دنوں میں وہ سب سے واقف ہو گیا۔ بڑے صاحب کے پانچ بچے تھے۔ تین لڑکے دو لڑکیاں۔ ایک لڑکا باقی تھا باقی سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے اور ان کی بیوی بھی یہیں رہتے تھے۔ کچھ اداس، مغموم، اور ہر دم گم صم رہتے تھے۔ پتہ چلا کر ان کی شادی کو دس بارہ سال گزر چکے تھے مگر ان کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ اور میاں بیوی میں کچھ کھٹ پٹ بھی ہوا کرتی تھی۔ دوسرے جو بھائی جان ہکلاتے تھے۔ ان کا ایک ننھا تھا۔ صنوبیہ دراصل بڑے سرکار کی نواسی تھی۔ مگر سب کے ساتھ انھیں آپی جی کہتی تھی اس کے دو بڑے بھائی اور تھے۔ مگر وہ کہیں اور پڑھتے تھے۔ کبھی لمبی چھٹیاں ہوتیں تو گھر آتے اور پھر طویل عرصے کے لیے واپس چلے جاتے۔ تیسرے صاحبزادے ابھی پڑھ رہے تھے۔ نجانے کاہے میں۔ ایاز کو وہ الجھا ہوا نام کبھی یاد نہ ہو سکا۔ حالانکہ بارہا اس نے سنا تھا اور حسرت سے سوچا بھی تھا کہ کاش وہ بھی انہی کی طرح پڑھا کرتا۔ ایک دن اس نے ان سے پوچھا تھا

"چھوٹے بھیا آپ کون سے مدرسے میں پڑھتے ہیں؟"

وہ ایک بڑی سخت منہ کتاب پر جھکے ہوئے تھے بولے "مدرسہ میں نہیں۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔!"

اوہ ہو! وہ پھر الجھ گیا۔ بھئی یہ نام لینے کی عادت اچھی نہیں۔ اس

نے نقطہ "عدد" نام سن رکھے تھے۔ بمبئی سٹی، کلکتہ سٹی۔ یہ بھیا کون سی سٹی میں جاتے ہیں۔ صبح گئے تین بجے چلے آتے۔ اب کون سی سٹی اتنے قریب ہے؟ ان سے پوچھنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک دن وہ ان کی موٹی موٹی کتابیں دامن سے صاف کر کے ڈیک میں سجا رکھا تھا۔ کبھی کوئی اچھی سی کتاب کھول کر دیکھ بھی لیتا شاید کوئی تصویر ہو۔ اسے ہاتھی اور شیر بہت پسند تھے۔ مگر وہ لرز کر رہ گیا کیونکہ شیر اور ہاتھی کی بجائے اس میں انسانی پنجروں کی بھیانک بھیانک تصویریں تھیں۔! پھر بھیا کمرے میں آگئے تھے اور اس کے پیلے خوف سے چہرے پر حسرت کا سایہ منڈلاتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"تھوڑا سا پڑھے لکھے ہو کہ نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کچھ دل بھر آیا تھا۔

"پڑھنا چاہتے ہو؟"

ایکی سر اثبات میں ہلا۔ پھر وہ چپکے سے کھانس کر شرماتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ارے۔ میں کیا چھوٹے بھیا!"

جاہل رہنا پسند ہے۔ کیوں؟ وہ پیار سے غرائے پھر کرسی پر ٹک کر غور سے اسے دیکھا۔ ایاز نظریں چرانے لگا۔

میں ابی جی سے کہوں گا۔ صنوبیہ اور ارقم کے اسکول میں تمھیں بھی شریک کرا دیں"

"نن۔ نہیں چھوٹے بھیا!" وہ گھبرا گیا۔

"کیوں۔!"

اب میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ لڑکے مجھے چڑھائیں گے!

"کچھ پرواہ نہیں۔ تم یہ بتاؤ کچھ پڑھنا آتا ہے۔؟ خالہ نے کسی سے
پڑھوایا نہیں تم کو۔؟"

"نہیں پڑھوایا۔" بڑی تیزی سے وہ بولا "مگر میں کرنل صاحب کے
بچوں کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا سیکھ گیا ہوں۔

اچھا؟ واہ واہ۔ شاباش۔ سناؤ تو ذرا۔ کیا سیکھ گئے ہو" ماما کی
حوصلہ افزائی سے اس کا دل پھول کر غبارہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس
نے کسی جھجک اور تکلف کے بغیر فر فر انھیں چوہے بلی، گدھے اور آدمی
کی انگریزی سنا دیں۔ پھر بابا بلیک شیپ اور ٹوئنکل ٹوئنکل اسٹار سنایا
وہ برابر ہنستے رہے اور پھر اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

"اچھا میں تمھیں پڑھاؤں گا۔ تم مجھے نہ جانے کیوں بہت اچھے
لگتے ہو۔ تم سے محبت معلوم ہوتی ہے۔"

ایک بات اور بتا دیجیے آپ کیا پڑھتے ہیں آپ کی کتابوں میں مردوں کی اتنی
تصویریں ہیں۔ آپ کو ڈر لگتا ہوگا؟"

"بیٹا میں میڈیسن کر رہا ہوں۔" وہ ہنسے، ہمیشہ ہی وہ ہنستے مسکراتے رہتے تھے
تصویروں کو دیکھ کر کیا ڈروں گا۔ میں تو مردے چیرتا بھی ہوں۔"!

"او۔ اللہ!" اس نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ "میں اگر ایڈیسن کروں گا
تو کیا مجھے بھی مردے چیرنے پڑیں گے۔

میڈیسن، میڈیسن۔ ایڈسن نہیں۔" انھوں نے اسکے بال مٹھی میں جکڑ کر
جھنجھوڑ دی۔ "اب تم کھیلو۔ کل سے اسکول جاؤ گے۔ سمجھے!"

ان کی پیار بھری جھنجھوڑی نے اس کی رگ رگ میں ان کی محبت

کے چیتھڑے جا رہی گردے ۔ خوشی کے مارے زور زور سے سر ہلاتا ہوا بولا
" اچھا ۔ مگر کتابیں ۔ ! "
" دلا دیں گے ! "
اچھا ۔ چھوٹے بھیا ! ! ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا وہ برآمدے میں نکلا ۔ صنوبیہ شفاف فرش پر بیٹھی اپنی کاپی میں ڈرائنگ کر رہی تھی ۔ وہ اس کے پاس جا بیٹھا اور تازہ خبر سنائی ! ۔ فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا ۔ صنوبیہ نے رنگین پنسل ہاتھ سے رکھ دیا اور حیرت و مسرت سے بولی " سچ ؟ "
" سچ چھوٹی بی بی ۔ آپ ہی کے اسکول میں بھیا شریک کرا دیں گے "
دونوں میں مستقبل کی باتیں ہونے لگیں ۔
" ہم ساتھ ساتھ اسکول جائیں گے اور ساتھ ہی واپس آئیں گے "
صنوبیہ نے کہا " وہ جو میری سہیلی الماس ہے نا ۔ کبھی مجھ سے خفا ہو جاتی ہے تو مجھے اکیلے آتے ڈر لگتا ہے ۔ مگر تم کہیں اپنے دوست تو نہیں بنا لو گے ؟ "
نہیں نہیں ۔ کبھی نہیں " اس نے بے حد توق سے جواب دیا " کیا کوئی دوست آپ سے اچھا بھی ہو سکتا ہے ۔ میں ہمیشہ آپ ہی کا دوست رہوں گا ۔ مگر نہیں " اداسی اس کے چہرے پر محیط ہو گئی " میں آپ کا دوست نہیں ہو سکتا ! " اس نے رنجیدہ ہو کر سر جھکا لیا ۔
" کیوں ۔ ؟ " صنوبیہ نے حیرت سے پوچھا " کیوں نہیں ہو سکتے ؟ چھوٹی بی بی ۔ گلوگیر لہجے میں اسی نے جواب دیا " میں تو آپ کا نوکر ہوں خالہ

مجھے سال بھر کی تنخواہ پر نوکر رکھا گیا ہے۔ ایک سال وہ آئیں گی اور مجھے پھر اپنے ساتھ لے کے چلی جائیں گی۔"

"نہیں۔ ایاز۔ تم ان کے ساتھ مت جانا۔!" صنوبیہ نے کہا۔ "تم ہمارے پاس رہو۔ پڑھو لکھو۔ اور ایک دن بڑے آدمی بن جاؤ۔

پھر تو ہم تم دوست بن جائیں گے!۔

بڑا آدمی۔؟

ہاں۔!

میں تو ابھی اتنا چھوٹا ہوں۔ بڑا آدمی کیسے ہوں گا؟۔

ارے۔ تم کتنے بدھو ہو" صنوبیہ ہنسنے لگی۔ اس کے ننھے سے دل میں یہ خیال آگیا تھا کہ اس کا دل رکھنا چاہیے۔ تسلی آمیز پیرایہ میں بولی "یہ سارے بڑے آدمی کیا یکبارگی بڑے بن گئے تھے۔ وہ کبھی ایک روز تمہارے اتنے ہی ہوں گے۔ آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔ اچھا۔ تم چاہو تو ابی جی سے پوچھ لو۔!"

نہیں آپ کی بات سچ ہے"۔ وہ مسکرایا۔ "میں ایک دن ضرور بڑا آدمی بنوں گا۔ پھر تو آپ مجھ سے دوستی کریں گی نا۔!"

صنوبیہ نے سر ہلایا "ہاں۔ میں تو اب بھی تمہاری دوست ہوں اور تم بھی میرے دوست ہو جاؤ گے تو میں اپنی سب سہیلیوں سے کٹی کر لوں گی!"

"کیوں؟ انھیں بھی رہنے دیجیے۔ پھر وہ آپ سے بگڑ نہ جائیں گی؟"

نہیں۔ پھر وہ اچھی نہ لگیں گی!

تو میں آج سے دوست ہوں آپ کا؟

دوست تو ہو۔ مگر یہ آپ کر کے کیوں بولتے ہو۔ تم مجھ سے بڑے ہو نا۔ اس طرح تو مجھے چاہیئے کہ تمہیں آپ کہا کروں! ابی جی کہتے ہیں کہ اپنے سے جو ایک دن بھی بڑا ہو اسے ادب سے پکارا کرو۔!

نہیں آپ مجھے ادب سے نہ پکاریے گا۔ مجھے شرم آئے گی!۔ یہ آپ کیا بنا رہی ہیں؟ بہت خوبصورت ہے!

یہ؟ کنول اور سورج مکھی کے پھولوں کی تصویریں ہیں۔ اچھی ہیں!

بے حد! مگر مجھے تصویروں سے زیادہ اصلی پھول پسند ہیں!۔

دونوں جو گہرے دوست بن گئے تھے۔ نجانے کتنی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔

پھر اس ہفتے سے وہ مدرسہ جانے لگا۔ بھابی نے اپنے چھوٹے بھائی ارشم کا نئی یونیفارم اسے دے دیا تھا۔ جب وہ یونیفارم پہنے اور نیا بستہ کندھے سے لٹکائے بڑی اماں کو سلام کرنے آیا اور بتایا کہ وہ بھی سب کے ساتھ اسکول جا رہا ہے تو فرط مسرت سے اس کا روان روان کھلا پڑ رہا تھا۔

صنوبیہ کے ساتھ وہ اسکول گیا۔

یہ اس کی زندگی کا بڑا دل خوش کن انقلاب تھا۔ اسے سیکنڈ اسٹینڈرڈ میں داخلہ ملا تھا۔ جب وہ سب کے ساتھ کلاس میں بیٹھا تو یوں لگ رہا تھا کہ مارے خوشی کے دل اب رکا کہ تب رکا۔!

اپنے عہد کی پابندی کرتے ہوئے اس نے کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا۔ ایسا نہ ہو کہیں چھوٹی بی بی خفا ہو جائیں۔! اگرچہ کہ اس کی دوستی کے خواہشمند بہت سے تھے لیکن وہ بس اپنی ننھی مالکن ہی کے

ساتھ لگا لگا پھرتا۔ ان کی کلاسیں مختلف تھیں۔ اسے نچلے درجہ میں داخلہ ملا تھا مگر وہ وقفوں میں مل بیٹھتے اور اپنی اپنی کلاسوں میں ہونے والے واقعات سناتے۔ ان کی دوستی روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

اسی اسکول میں صنوبیہ کی منجھلی بھابی کا چھوٹا بھائی ارقم بھی پڑھتا تھا۔ اسے بڑی بہن نے مدرسہ کے قریب ہونے کی بنا پر اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔ وہ ایاز سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ لیکن فطرت و سرشت میں اس سے کچھ مختلف طبیعت میں رشک، بدگمانی اور کچھ حسد تھا۔ وہ خود سے کسی کو بڑھتے ترقی کرتے مشکل سے دیکھتا۔ چونکہ اسے اسی گھر میں سب بچوں کے ساتھ اس کی بڑی چھنتی تھی۔ خاص کر وہ صنوبیہ سے زیادہ قریب تھا اور وہ بھی اسی کے ساتھ رہتی۔ کھیلوں میں اس کی ساتھی بنتی۔ اب اس نے ارقم کا ساتھ چھوڑ دیا اور غیر ارادی طور پر ایاز کی طرف آنے لگی۔ چند روز تو ارقم یہی سمجھتا رہا کہ خود اسی کو غلط فہمی اور مغالطہ ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح صنوبیہ کی رفاقت کی تلاش میں اس کے ارد گرد پھرتا رہا تھا۔ صنوبیہ نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ تب اس کا ماتھا ٹھنکا۔ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تھا اور پڑھتا بھی تو اونچی کلاس میں۔ اس کے دوست احباب بھی خاصے ہوشمند تھے۔ انھوں نے اپنی دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ارقم کو ہر فن مولا بنا دیا تھا۔ انہی نے اسے اور بھی بہت سے جذبوں سے روشناس کرا دیا تھا۔ لہٰذا وہ رقابت، محبت، مفارقت اور انتقام وغیرہ کے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ اپنے دلی محسوسات کے چھپانے میں بھی اسے مہارت آ گئی تھی۔ خود پر جبر کرنا اور موقعہ محل دیکھ کر کاری ضرب لگانا بھی اسے

آتا تھا۔ بظاہر وہ معصوم اور ناسمجھ بچہ تھا۔ اس کی خاموشی اور افسردگی کو کسی نے پہلے پہل محسوس نہ کیا۔ یہ بھی ادراک کسی کو نہ تھا کہ وہ اندر اندر پھنک رہا تھا۔ صنوبیہ اور ایاز کی بڑھتی ہوئی دوستی اسے خاک کر رہی تھی۔ انھیں زک دینے اور اپنا پہلو بچائے رکھنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا تھا! ایاز سے اسے سخت ترین نفرت تھی۔ اسے منہ لگانا پسند نہ کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ارقم کے سلوک کا اندازہ ایاز کو بھی ہو گیا۔ خوامخواہ وہ اس پر پھبتیاں کستا رہتا۔ دل شکستہ اور رنجیدہ سا وہ زیادہ سے زیادہ صنوبیہ کی توجہ اور ہمدردی کا مستحق بنتا گیا۔ ارقم نے اب دوسرا رخ اختیار کیا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ اس گھر کی قدیم خادمہ کے ساتھ آیا تھا اور خود اسی کے ماں باپ بہن بھائی اور خاندان کا کوئی پتہ نہیں اب اس نے دوسری طرح نیش زنی شروع کر دی۔ نجانے اپنے بدمعاش دوستوں سے کیا کہا تھا کہ اب جدھر سے ایاز گزرتا۔ اسے اس قسم کی دل شکن بکواس سننی پڑتی!۔

"ارے بھئی تمھیں معلوم ہے کہ پہلے زمانے میں آسمان سے کھانا اترتا تھا۔ اب آج کل کے زمانے میں آدمی بھی آسمان سے اتر رہے ہیں"

"سچ مچ؟" شریر لڑکوں میں استہزائیہ ہنسی کی آواز ابھرتی۔

"ہاں۔ چاہے ان کے ابا امی نہ بھی ہوں!" ارقم کنکھیوں سے اسے دیکھتا کہ چہرہ لال پیلا ہو رہا ہے کہ نہیں؟ مگر وہ بے بس چہرہ زرد غم سے صرف سفید ہوتا نظر آتا تھا۔

"خودرو درخت یونہی اُگ آتے ہیں" کسی کی دشکنی آواز ابھرتی۔

"مگر ایک خودرو درخت ہمارے ہاں بھی اُگا ہے" ارقم کہتا۔ "اس

کا نام ۔۔۔ !"

ایاز ۔۔!" کمی آوازیں ایک نعرہ بن کر ابھریں۔۔ اور پھر وہ ساری آوازیں ایک قہقہہ میں بدل کر جیسے بجلیاں سی اس کے دل پر گرا دیتیں۔

اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ جدھر سے ایاز گزرتا اس کے کانوں میں دبی دبی ہنسی کی آواز آتی کبھی کوئی دل آزار سا فقرہ دل کو چھیدتا ہوا گزر جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ نروس ہوتا گیا اور تعلیم سے اس کی دلچسپی کم ہو گئی!

ایک ٹیچر نے اس کی کمزور رپورٹ گھر بھجوا دی۔

رپورٹ ابا جی پڑھ رہے تھے اور وہ سر جھکائے کھڑا اپنے آنسوؤں کے ریلے کو واپس دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا!۔

اس وقت بھی سب موجود تھے۔ اور اسی کو گھور رہے تھے۔ چھوٹے بھیا کی تیر کی سی نظریں اسے چہرے پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ انھوں نے اس کا شوق دیکھتے ہوئے اسے پڑھوانے کی کوشش کی تھی۔ کتابیں بھیا کی تھیں۔ فیس دی تھی۔ ان کے چہرے سے دکھ کا احساس اور غصہ عیاں تھا۔ اور ان کی نگاہوں سے نگاہیں ملانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

بڑے صاحب نے سفید بالوں سے ڈھکا سر اٹھایا۔ آج ان کی پرمحبت آنکھوں سے کچھ بے مہری سی جھانک رہی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر انھوں نے رپورٹ میز پر رکھ دی اور بولے: "افسوس ہے۔ ہر مضمون میں نمبر کم، حساب میں صفر، کیوں بیٹا کیا پڑھنے کا جی نہیں چاہتا؟ ہم نے اسی لیے تمھیں گھر کے کاموں سے بچائے رکھا تھا کہ تم اگر تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہی سہی۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔!"

تمہاری خالہ کون سے گاؤں گئی ہیں۔ میں انھیں خط لکھے دیتا ہوں آ کے تمھیں لے جائیں۔ !" چھوٹے بھیانے کہا۔

اور بس۔ چھالا پھوٹ گیا۔ وہ خود بھی پھوٹ پڑا۔ دکھ کے ہجوم میں اتنا خیال و ادراک تو تھا ہی کہ بھابی کے بھائی کی شکایت کرنا اس کے حق میں ٹھیک نہیں۔ اگر تعلیمی کمزوری گاؤں جانے کا بہانہ نہ بھی بنے تو ارقم کی شکایت دربدری کا سبب ضرور بن جائے گی۔!"

بڑے صاحب"۔ اس نے ہچکی لی۔" تم۔ مجھے۔ اسکول کے بچے بہت چڑھاتے ہیں۔ مجھے خود رو درخت کہتے ہیں۔ بڑے صاحب، میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ مجھے سب ہی چڑھائیں گے۔ ماریں گے۔ میں اب اسکول نہیں جاؤں گا۔ مجھے گاؤں نہ بھجوائیے۔ میں۔ گھر میں کام کاج کرلوں گا۔ خالہ نے کہا تھا کہ۔ آپ کو گھر میں کام کرنے والے لڑکے کی ضرورت ہے!۔ یہ کہہ کر اس نے بوسیدہ سی آستین آنکھوں پر رکھ لی اور اس بری طرح رو دیا ہے کہ بڑی بیگم کی آنکھیں بھی چھلک اٹھیں دوسرے لوگ بھی کچھ سکتہ زدہ سے تھے۔ بالآخر اسے ماں باپ کی عدم موجودگی کا خیال آ ہی گیا۔ بڑی بیگم نے اس کا بازو تھام کر اپنے پاس کھینچا اور پاس بٹھا لیا۔ پھر آواز سنبھال کر بولیں:" نہ بیٹا۔ روتے نہیں بیٹا۔ تمہارے صدر مدرس کے ہاں خود بھیجوں گی کہ لڑکوں کو قابو میں رکھیں۔ پریشان مت ہو۔ تم جی لگا کے پڑھو لکھو۔ بڑا آدمی بن جاؤ سمجھے!"

بڑا آدمی: یکایک ارقم ہنس پڑا: ممانی اماں۔ کیا یہ بڑے

آدمی بنیں گے۔ میرے اترے ہوئے کپڑے پہن کے۔ گھر بھر کا جھوٹا کھا کے۔ ہاہاہا۔!"

"ارقم۔! چھوٹی بھابی نے اسے ڈانٹا۔

"بھئی۔ یہ ان کے خیالات کیسے عجیب ہیں؟" بڑے صاحب نے تعجب سے کہا۔

"کن لونڈوں میں اٹھتے بیٹھتے ہو؟" بڑے بھیا نے پوچھا۔

ارقم پر لعن طعن کی بوچھار شروع ہو گئی۔ وہ منھ بچھا کے بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔

"آؤ۔ تم میرے ساتھ چلو!" بڑے صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں لائے!۔

"اب بتاؤ!۔ کیا ہوا!؟" انھوں نے دروازہ بند کر کے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے اسے اپنے پاس قالین پر بٹھا لیا۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے بے کم و کاست سب کچھ کہہ دیا۔

انھوں نے طویل سانس لی "اچھا۔ میاں۔ تم اطمینان رکھو میں تمھیں دوسرے مدرسہ میں شریک کرا دوں گا!"

"نہیں۔ صاحب۔!" وہ ان کی پنڈلیوں سے چمٹ کر گھگھیایا۔

"کیوں۔؟" وہ بڑے حیران ہوئے۔

"دوسرے اسکول میں میرا دل نہیں لگے گا!" وہ جھینپ کر الگ ہو بیٹھا۔

"مگر میں پوچھتا ہوں۔ آخر کیوں؟"

"وہاں۔ وہاں۔ میں اکیلا ہوں گا صاحب۔ صنوبیہ بی بی تو نہ ہوں گی

گی وہاں۔

"صنوبیہ۔ کیا مطلب؟" وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

"ہم۔ مطلب"۔ اس نے سر اٹھایا۔ بے حد خلوص، وثوق اور ناقابل فہم سے انداز میں جواب دیا "صاحب۔ ہم نے آپس میں کہا ہے کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے دوست بنے رہیں گے۔ صنوبیہ بی بی نے مجھے اپنا دوست بنا لیا ہے۔ وہ بھی کسی کو اپنی سہیلی نہیں بناتیں۔ صاحب۔ اسی سے بھی تو ان کی سہیلیاں خفا ہیں!"

اور تبھی ایک خونیں مستقبل ان کے سامنے آگیا۔ دو تنومند مرد۔ ایک گھبرزدہ سی لڑکی۔ مردوں کی خونخوار سرخ آنکھیں۔ لڑکی کی پرنم آنکھیں۔ اور پھر یہ سرخ دھند یکبارگی صاف ہو گئی لیکن بڑے صاحب کو بڑے کرب میں چھوڑ گئی۔

انھوں نے کہا "اچھا ایاز۔ تم اسی اسکول میں پڑھنا چاہتے ہو تو میں تمھیں اپنے ایک دوست کے ہاں پہنچائے دیتا ہوں۔ اس طرح بہت آسانی ہو جائے گی۔ ارقم پھر تمھیں ستا نہ سکے گا۔ سمجھے! میں وہاں آکر تم سے مل جایا کروں گا؟"

ایاز کا چہرہ سست ہو گیا۔ بولا "بڑے سرکار۔ میں چاہے پڑھوں چاہے نہ پڑھوں۔ مگر میں آپ کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گا!"

"بیٹے تم ابھی چھوٹے ہو۔ تم سمجھتے نہیں" انھوں نے اس کا سر سہلا کر سمجھایا "مگر میاں سوچو کہ مسلمان گھروں میں لڑکے لڑکی کی دوستی اچھی نہیں سمجھی جاتی! تم بے شک بہت اچھے بچے ہو۔

سمجھ دار بھی ہو۔ مگر کیا تم کو خود اچھا لگے گا کہ لوگ کہنے لگیں۔ واہ بھئی ایاز میاں اپنی بہن صنوبیہ کے آگے پیچھے پھرا کرتے ہیں۔ تم تو مرد ہو۔ تم کو اپنی بہن کا خیال کرنا چاہیئے!۔ کیوں؟"

ایاز نے سُنتا ہوا چہرہ اٹھایا۔ ویرانی اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔ پپڑی پڑے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں بڑے صاحب۔ چھوٹی بی بی کو کوئی کچھ کہے گا تو مجھے اچھا نہ لگے گا۔"

"تو پھر میں تمھیں دوسرے گھر میں پہونچا دوں؟"

"اچھا۔ بڑے صاحب!" ہونٹ بھینچ کر اس نے آنسو پیئے۔ اگرچہ کہ بڑے سرکار سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہی تھی مگر مصلحتاً۔ انھوں نے اس کی اشک شوئی مناسب نہ سمجھی!۔

صنوبیہ کو خبر بھی نہ لگی۔ اور شام کو چائے کے بعد کسی سے کچھ کہے بغیر بڑے سرکار نے اسے اپنے دوست نظام صاحب کے ہاں پہنچا دیا۔

اس کے خواب پھر بے تعبیر رہ گئے!۔ خیال پرست ذہن حقیقت کی تلخیاں برداشت نہیں کر سکتا!۔ چند ہفتے ایاز کے خود ساختہ بہشت میں گزرے تھے اور اب پھر غیروں کے جہنم میں سلگنا پڑا۔ نظام صاحب اور ان کا خاندان اتنا حساس اور جذباتی نہ تھا کہ ایک معمولی سے بے سروسامان لڑکے کو غیر معمولی اہمیت دیتے۔ وہ تو ملازم تھا۔ اس سے

ایسے ہی کام لیے جانے لگے!۔ نظام صاحب کی بھاری بھرکم بیوی ان کی صاحبزادیاں دن بھر اسے نچائے رکھتیں۔ سودا سلف لانے کے لیے بار بار اسے بازار بھیجا جاتا۔ اور چھوٹی سی غلطی پر کان کھینچے جاتے۔ تعلیم و مدرسہ تو کبھی کا سلام کر کے اس سے رخصت ہو چکے تھے آج جو نظام دہ زتھا اور اس کا حال ابتر تھا۔ چائے کی طشتری کے ٹوٹنے پر بیگم نے ایک طوفان اٹھا دیا تھا اور پھر وہ اپنا زخمی انگوٹھا لیے بہتے خون کو دیکھ کر سہما جا رہا تھا دوسرے بیگم کی کڑک دار آواز۔ ناقابل ختم صلواتیں۔ انھوں نے اس کے انگوٹھے وغیرہ کی پرواہ کیے بغیر ایسے زوردار تھپڑ اسے رسید کیے تھے کہ ان کی جھنجھناہٹ دماغ تک پہونچی تھی اور دماغ بج رہا تھا۔

"پھر آؤ ایسے جہاں سے لائے ہو۔ کام کا نہ کاج کا ڈھائی سیر اناج کا۔ ایسے بے چارے بادشاہ زادے ہیں کہ کام نہیں کریں گے۔ کوئی تین وقت پلاؤ قورمہ کی سینی منھ کے آگے دھر دیا کرے۔ ارے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر بھیا کے گھر پڑھتا تھا۔ نخرے تو ایسے ہیں نہ معلوم سید بھائی نے کیسے کھوپڑی پر چڑھا لیا ہے۔ مرا فقیر بچہ۔۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ وہ بڑھی تجہ میرن جانے کس ناجائز اولاد کو سید بھائی کے گلے لگا گئی ہے۔ انھوں نے آمنا صدقنا کہہ کے رکھ بھی لی۔ میں تو پاپ کی پوٹ کو اپنے صاف ستھرے گھر میں نہ رکھوں گی۔ مارے موئی غلاظت، اوقات دو کوڑی کی۔ باتیں نوابوں کی سی؟"

ان کے اس افلاطونی کہرام نے نظام صاحب کے کان بھی کر دیے۔ اپنے تو ہے گناہ کی پسلا دار کا تصور بھی گھناؤنا ہوتا ہے۔ انھوں نے ایاز کو حکم دے دیا کہ وہ چوکیدار کے کمرے ہی میں رہے۔ اوپر والانوں اور شفاف

کمروں میں نہ آئے! پھر انھوں نے اپنے ایک ملازم کو بڑے سرکار یعنی سید صاحب کے ہاں بھجوا دیا کہ آ کے ایاز کو اپنے ساتھ لے جائیں۔

سید صاحب ایک عجیب مخمصہ میں الجھ گئے تھے۔ پرانے وقتوں کے آدمی تھے۔ انھیں تجربہ تھا کہ بچوں کی بنیادی محبت اور لڑکپن کا سیدھا سادھا خلوص آخیر میں چل کے بہت پختہ اور پائدار ہو جاتا ہے۔ کئی ایک خرابیوں اور معاشرے میں رسوائیوں کا باعث۔!

بیوی نے انھیں مشورہ دیا تھا "فکر کرنے کی کیا بات ہے۔ کسی بورڈنگ میں رکھوا دیجئے۔ خرچہ ہوگا سو اس کا کیا۔ دے دیا کریں گے!۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ لڑکا آخر ہے کون۔ میرن بی کے پاس آیا کہاں سے تم کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کون سے گاؤں گئی ہے۔ میں انھیں پھر بلاتا اور سارے حالات پوچھتا۔!" سید صاحب پریشان ہوتے جا رہے تھے۔

مجھے تو دھیان ہی نہ آیا" بیگم نے کہا "ایاز ہی سے پوچھیے۔ شاید دے بتا کے گئی ہوں۔

"میں تو یہ ڈرتا ہوں کہ کہیں ایاز کی توجہ اور دوستی ہاجرہ کو ناگوار نہ گزرے" سید صاحب نے آواز نیچی کرلی "وہ بے چاری بس بچوں ہی کے سہارے تو جی رہی ہیں۔ پے در پے واقعات نے دل چھلا بنا رکھا ہے۔ سوچیں گی کہ صنوبیہ کے ساتھ کے لیے بس ایاز ہی رہ گیا تھا۔!"

کیا بات ہے ابی جی۔ آپ لوگ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں" شکیل نے پوچھا۔ کمرے کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ماں باپ کو فکرمند دیکھ کر کمرے میں آ گئے تھے۔ انھیں بھی ایاز کے جانے کا خیال ستا رہا تھا۔ انہی کی کوششوں سے وہ مدرسہ میں داخل ہوا اور پڑھ رہا تھا۔

سید صاحب نے مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ اشکیل ہنسنے لگے۔" اف توہ۔ ابی جی آپ کی اور امی کی بیش بینیاں۔ ایاز بالشت بھر کا نا سمجھ بچہ ہے۔ صنوبر کم عمر معصوم سی بچی ان کی دوستی ایک گھر میں رہنے اور ایک مدرسہ میں پڑھنے کی بنا پر رہی ہے۔ آپ ایاز کو نظام چچا کے گھر والوں کے ستم سہنے کے لیے چھوڑ نہ دیجیے۔ میرن بی اسے لاوارث بچہ کے آپ کے سپرد کر گئی تھیں۔ اس کی ذمہ داری آپ پر ہے، چند دن برداشت کر لیجیے۔ میرن بی ضرور واپس آئیں گی۔ تب ان کے حوالے کر دیجیے گا!۔ ابی جی۔ اگر وہ قانونی بچہ نہ بھی ہو تو کیا۔ انسان تو ہے اپنے حالات کا ذمہ دار وہ خود کب ہے۔ آپ شریف کو بھجوائیے۔ وہ ایاز کو اپنے ساتھ لے آئے!"

مگر صنوبر!" بیگم نے کہا۔

میں ایاز کو پیار سے سمجھا دوں گا۔ وہ اس کے ساتھ نہ رہا کرے۔ بہت سمجھدار لڑکا ہے۔ مجھے بہت مانتا ہے۔ میرا کہا نہ ٹالے گا!۔

دوسری مصیبت ارقم کی ہے" سید صاحب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اور مزید مدھم لہجے میں کہا" میں یہ گوارہ نہیں کر سکتا کہ وہ خواہ مخواہ کی دشمنی میں غریب بچے کا جگر چھلنی کیا کرے۔ اگر ارقم کو کچھ ہو تو دلہن کو ناگوار ہو گا۔ میں پچھتا رہا ہوں۔ ان حالات اور ان کے عواقب پر نظر کیے بغیر ایاز کو پناہ دینے کی حامی کیوں بھر لی؟"

"بڑھیا نگوڑی خود ائی خوار ساڑھے تین سو بھی لے مری"

بیگم نے کہا" موئی بیچ گئی لڑکے کو۔ بہانہ بنا کر مراد چلی بھاگ گئی ہے۔ اب جو قیامت تک صورت دکھائے۔ لکھ لو"

اوہ۔ امی رائی کا پہاڑ مت بنا دیجیے" شکیل حیران تھے" یہ کون سا

ایسا سنجیدہ مسئلہ ہے جو آپ لوگ یوں پریشان ہو رہے ہیں۔ ابی جی۔ دن بھاگ رہے ہیں۔ آج کیا ہے کل کیا ہوگا۔ چند دن کی مصیبت ہے۔ تھوڑے عرصے بعد جب اسے سمجھ آئے گی تو وہ خود بھی ہاتھ پیر توڑ کر ہمارے ٹکڑوں پر نہ پڑا رہے گا۔ اپنی روزی تلاش کرنے چلا جائے گا۔!

"تو پھر کیا رائے ہے۔ اسے بلوا بھیجوں۔ جب سے کریم نے آکے کہا ہے کہ اسے بخار ہے اور نظام بھائی کی بیوی نے اس کا داخلہ اپنے ہاں بند کر دیا ہے۔ برابر میرا کلیجہ مسوس رہا ہے۔ اس کی تکلیف کا باعث میں ہی تو ہوں۔ معمولی سی بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی ارے ایک گھر میں رہتے ہوئے بچے آپس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ تو میں اسے بلوالوں؟"

سید صاحب کے چہرے پر پھر تازگی سی آگئی۔

"میں شام کو ٹہلنے جاؤں گا۔ واپسی پر اسے لیتا آؤں گا۔ آپ فکر نہ کیجئے" شکیل نے کہا۔ انھیں ایاز سے عجیب سی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے کہا "مگر یہ ادو تم آخر اس غریب کا دشمن کیوں بنا ہے؟ حالانکہ بھابی اتنے اچھے مزاج کی ہیں۔ ہمیشہ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہیں۔ اس کی کل ٹیڑھی ہی لگتی ہے۔"

بیگم نے برا سا منھ بنا کر جواب دیا "ناز و نعم میں پلا بڑھا ہے۔ تین بہنوں کا سب سے چھوٹا اور آخری بھائی ہے۔ لاڈ پیار میں بگڑ گیا۔ کوئی کچھ کہہ کر برا کیوں بنے۔ آپ ہی عقل آئے گی!"

پھر شکیل تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلے گئے۔ سید صاحب نے اخبار سنبھالا اور بیوی نے پاندان سامنے سرکایا اور کسی گہری سوچ میں غرق دھجی سے چونے کتھے کی کلھیاں صاف کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد سید صاحب نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور بیوی سے بولے

"بیکار ہے مسئلہ پر میں نے اتنا وقت برباد کیا۔ سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔ اگر ایک پیالی چائے کسی سے بنوا سکتی ہو تو بنا کے لیے آدھ تھوڑی دیر آرام کروں گا!"

بیوی پاندان اٹھا کر چلی گئیں اور دس منٹ بعد صنوبیہ کی ممی ہاجرہ چائے لے کر آئیں تو باپ کو فکرمند دیکھا۔ مگر وہ بے حد کم سخن، اور دبے دبے مہذب خاتون تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں پتہ تھا کہ سید صاحب کی ساری پریشانیوں اور فکروں کا مرکز وہ خود بھی تھیں!۔ جب تک وہ چائے پیتے رہے ہاجرہ خاموش رہیں۔ پھر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابی جی کوئی الجھن آپ کو میری وجہ سے ہے؟"

"کیوں۔ کیا کسی نے تم سے کچھ کہا ہے!" سید صاحب کا دل دھڑکا۔

"شکیل نے کچھ تذکرہ کیا تھا" ہاجرہ بولیں۔ "ابی جی اگر آپ کا آرام اسی میں ہے تو آپ مجھے تھوڑے دنوں کے لیے اجازت دیجئے۔ مجھے بڑے ماموں جان بہت عرصہ سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ میں سال دو سال کے لیے ——!"

"بیٹی۔ میرے پاس رہتے تم گھبرا گئی ہو کیا؟"

ہاجرہ نے دکھ بھری سانس لے کر سر جھکا لیا۔ "میرے شب و روز اندھیرے کے دن رات ہیں۔ ابی جی۔ صبح ہو چاہے شام، ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بس آپ کو فکرمند دیکھنا پسند نہیں کرتی"

"نہیں۔ تم اپنے دل پر جبر کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے دور ہو جاؤ!" سید صاحب نے کہا۔ "ویسے میں بڑی دلہن کا نا مناسب سلوک بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ خدا کی بھی مرضی تھی کہ وہ صاحب اولاد نہ

ہوں۔ اس میں کسی کا کیا دخل ہے۔ یقین، تم سے انھیں کیا دشمنی ہے کہ کسی وقت بھی سیدھے منھ نہیں بولتیں"۔

"جبیر کو مانگ رہی تھیں۔ بھائی جان کی مرضی بھی یہی تھی لیکن میں کیسے دل پر پتھر رکھتی۔ بس یہی دشمنی ہے۔ کہہ چکی ہیں کہ بچوں کو ان سے دور رکھنے کی خاطر میں نے انھیں ان کے چچا کے پاس بھجوا دیا ہے"۔ ہاجرہ کے مغموم چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھری۔ "اگر وہ سچ مچ بچوں کی بہی خواہ ہوتیں تو ان کے اچھے مستقبل سے انھیں محروم کرنے کی کبھی کوشش نہ کرتیں۔!

"اللہ پر نظر رکھو بیٹی"! سیّد صاحب نے جواب دیا۔ "کبھی زمانہ یکساں نہیں رہتا ہو سکتا ہے کہ خدا ان کی مراد بھی پوری کر ہی دے گو کہ اب توقع کم ہے۔ شادی کے بارہ تیرہ سال گزر چکے۔ یہی دکھ تو عدیل کو بھی ہے۔ خیر اب اس کا تذکرہ کیا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے محسن میاں کے ہاں جانے کا تذکرہ کیوں کیا تھا۔!

"میں نواز قمر اور ایاز کے جھگڑے سے بھی پریشان رہتی ہوں"۔ ہاجرہ نے کہا۔ "کتنی بری بات ہے کہ ایک بچی کی خاطر مالک و خادم میں تو تو میں میں آج یہ حال ہے۔ کل کیا ہو گا۔ جبکہ تینوں ہی کو اس گھر میں رہنا ہے۔!"

تم بھی بیٹی میری ہی طرح خفقانی ہو"۔ سیّد صاحب ہنس دیے۔ "ابھی میں کہہ چکا ہوں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ ایاز تھوڑے دنوں بعد اس گھر سے چلا جائے گا۔ اور قمر تعلیم کے ختم پر اپنے گھر کی راہ لے گا۔ اور صنوبر ماشاءاللہ سسرال کی ہو رہے گی۔ پھر تمہارے بچے اس قابل ہو جائیں گے کہ تم کو سہارا دیں۔ ایک وقت آئے گا جو کارخانہ یونہی نہیں رہے گا بیٹی"۔

آپ کو پتہ نہیں ابی جی: ہاجرہ نے بڑی تشویش سے کہا۔ یہ جو چار پانچ دن سے ایاز گھر میں نہیں ہے تو صنوبیہ نے کیا غیل مچایا۔ ارقم کی خوشی پر دونوں میں بڑی لڑائی ہوئی۔ میں حیران ہوں۔ ایاز کو رکھانے کے لیے خالہ میرن کو ہمارا ہی گھر ملا تھا!۔ ابی جی کچھ آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہے کون اس کے ماں باپ کہاں ہیں۔ بڑی بی کے پاس وہ آیا کہاں سے ہے؟!"

"سارے جھگڑوں کا خاتمہ بہت جلد ہو جائے گا بیٹی۔ میں ایک بے یار و مددگار لڑکے کو محض تقدیر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اس کا یہاں رہنا بھی مناسب نہیں۔ یا تو اسے کسی ہوسٹل میں شریک کرا دوں گا یا پھر میرن بی کا پتہ نشان معلوم کر کے انھیں بلا دوں گا اور ان کے حوالے کر دوں گا۔ تم اطمینان رکھو۔ خدانخواستہ صنوبیہ کی ذات کسی طرح ملوث نہ ہو گی۔!"

"چھوٹا سا پودا ایک دن تناور درخت بن جاتا ہے ابی جی۔ بس میری زندگی کا خیال رکھیے گا۔!"

ان کے جانے کے بعد سید صاحب پھر سوچ میں گم ہو گئے۔

ہاجرہ، سید صاحب کی بڑی چہیتی بیٹی تھیں۔ بڑے دو لڑکے خاصی عمر کے ہو چکے تھے تب وہ پیدا ہوئیں۔ اور اسی مناسبت سے ان کا دلار بھی اتنا زیادہ کیا گیا کہ وہ بڑی خود رائے سرکش اور نسائیت کی عام روش سے ہٹ کر اپنی من مانی راہوں پر چلنے لگیں۔ بی اے کرنے تک ان کا یہ حال تھا کہ مارے غصے اور مزاج کے چڑچڑے پن کے ناک پر مکھی بیٹھنے نہ دیتی تھیں ان کی وہ عادتیں جو پہلے پہل بچپن پر محمول کر کے گوارہ کر لی گئیں۔ بعد از وقت نہایت ناگوار اور دلخراش معلوم ہونے لگیں۔ لیکن اب کسی سے

کچھ نہ ہوا۔ ماں نے چپکے چپکے نصیحتیں کیں۔ باپ نے درسانیت سے سمجھایا لیکن انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اور اپنی من مانی کرتی رہیں۔ اس عرصہ میں بڑے بھائی عدیل کی شادی ہوئی۔ بھابی بھی تنک مزاج اور تعلیم یافتہ ملیں۔ شروع شروع میں دونوں دوست بن کر رہی تھیں پھر معمولی معمولی باتوں پر اختلاف شروع ہوئے۔ ہارنا کسی کو بھی گوارہ نہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ اب دونوں میں اتنی ہی دشمنی ہوگئی۔ ہاجرہ نے بھاوج کو بے اولادی کے طعنے بھی دیئے۔ یہ طعنہ شہلا کو سخت ناگوار گزرا۔ انھوں نے عدیل سے خوب شکایت کی۔ عدیل اپنی بہن کو چاہتے تھے۔ انھوں نے بہن کو سمجھایا۔ بیوی کو بھی ہدایت کی کہ اتنی سخت نہ ہوں۔ لیکن کب تک۔ مسلسل جنگ زرگری نے بالآخر عدیل کو بھی بیزار کردیا اب وہ کسی کی طرف بھی نہیں بولتے تھے۔

پھر جمیل کا بیاہ ہوا۔ لیکن ہاجرہ نے کچھ دلچسپی نہ لی۔ انھوں نے اپنی دلچسپی تلاش کرلی تھی۔ بی اے کے بعد انھوں نے کسی کی اجازت لیے بغیر یونیورسٹی جوائن کرلی تھی۔ یہاں کا ماحول ہی اور تھا۔ نئی فضا، دلچسپ ساتھی اور جانے کیا کچھ تھا۔ انھوں نے ایک سینئر طالب علم میں شدت سے دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ ان صاحب نے بھی جواب میں گرمجوشی دکھائی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ حال ہوگیا کہ دونوں کلاسیں گول کرکے پارک یا کسی اور تنہا جگہ مل بیٹھتے اور آئندہ کے پروگرام بناتے!۔ یونیورسٹی کے کھیلے کھائے تجربہ کار لڑکے جو لڑکے کم اور مرد زیادہ ہوتے ہیں وہ ایسے ہی مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بیگ صاحب اور ان کے کنبہ کے کسی فرد کو پتہ نہ تھا۔ ہاجرہ نے پڑھائی سے فیض کم اٹھایا اپنی صورت کا فائدہ زیادہ۔ پانی جب سر سے

اونچا ہوگیا۔ تب فیاض کے دل میں نیکی آئی اور انھوں نے ہاجرہ سے نکاح کرلیا۔ سیّد صاحب اس اچانک حادثے سے بیمار ہوگئے۔ ان کی بیوی خودکشی پر آمادہ ہوگئی تھیں۔ لڑکوں نے اپنی بے سروسامانی کی دہائی دے کر انھیں اس اقدام سے باز رکھا تھا۔ ان دنوں سید صاحب کے گھر میں یوں لگتا تھا جیسے بیک وقت کئی جنازے اٹھے ہوں۔ افسردگی، سنسانی ویرانی در و دیوار کا مقدر بن کر رہ گئی تھی۔ بڑے شرمندہ تھے لڑکے باہر نکلتے گھبراتے۔ رسوائی انگشت نمائی کا خوف۔ انھیں گھر ہی میں قید رکھتا۔ سید صاحب اور ان کی بیگم کے بنائے کچھ نہ بنتا تھا۔ ہاجرہ کسی کے بہکانے سے بھٹکی کہاں تھیں انھوں نے نکاح کیا تھا! کوئی فعل بد نہیں کیا تھا۔ وہ ایک بار فیاض کو اپنے ساتھ گھر بھی لائی تھیں۔ مارے باندھے سب کو ان کی پذیرائی کرنی ہی پڑی مگر ایک کھسیاہٹ تھی جو سب کے چہروں پر محیط تھی۔ سید صاحب فیاض سے رسمی طور سے ملے اور کسی کام کا بہانہ کرکے اٹھ گئے۔ بیگم بڑی عجیب سی داماد کے سامنے بیٹھی ادھر ادھر کی بے معنی باتیں کرتی رہی تھیں۔ عدیل اور جمیل بھی دل برداشتہ تھے ہاجرہ کی سب سے چھوٹی بہن عامرہ بہن کی شادی کی خوشی میں ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی اور ضیافت کا انتظام کررہی تھی۔ گھر بھر میں ایک وہی خوش تھی۔

سیّد صاحب نے اپنے زمانہ ملازمت میں خاصا کمایا تھا۔ پولیس محکمہ میں اعلا عہدہ پر تھے۔ انھوں نے لڑکیوں کا معقول جہیز جوڑ رکھا تھا۔ داماد کے لیے بھی 'سلامی' کے نام پر بھینٹ تیار تھی۔ لہٰذا انھی خوشی دل پر جبر کرکے جہیز ہاجرہ کے حوالے کیا اور سلامی میں فیاض کو

ان کے تمام سے محفوظ رقم عطا کر دی۔! ہاجرہ جب مسہری پر نظر ڈال گھر سے جا رہی تھیں تب ان کی یہ مکروہ اور بے شرم خوشی ماں کو اچھی نہ لگی فیاض اور ہاجرہ کا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پاس پاس کھڑے ہونا ہی انھیں پھوٹی آنکھ نہ بھا رہا تھا۔ چپکے چپکے دانت پیس رہی تھیں!

بالآخر جب ہاجرہ نے انھیں آخری سلام کیا تھا اور فیاض حبیب صاحب اور عدیل و جمیل وغیرہ سے رخصت ہو رہے تھے تب بیگم نے بے حد خشک اور بے مہر لہجے میں کہا۔

"تم نے اپنی پڑھائی اور شریف خاندان میں بدنامی اور رسوائی کی کالک لگا دی ہے۔ خیر جو تمھاری مرضی تھی وہ تم نے پوری کر لی۔ دعا ہے کہ یہ کچے دھاگے کی سی شادی تمھیں راس آئے مگر میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ کبھی سسرال سے کھٹ پٹ ہو جائے تو پھر یہاں کا رخ نہ کرنا!"

ہاجرہ کو سخت غصہ آیا تھا۔ بڑے جارحانہ انداز میں انھوں نے کہا تھا کہ ہرگز نہ آئیں گی۔

سسرال میں ان کی پذیرائی ویسی نہ ہوئی جیسی انھیں متوقع تھی۔ ساس سسر کھنچے کھنچے سے تھے۔ دو نندیں جو چھوٹی تھیں وہ بھی زیادہ خوش نہ تھیں۔ ہاجرہ سے کوئی کھلے دل سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک اچھوت کی طرح اپنے کمرے میں پڑی رہتیں۔ اگر کبھی ساس نندوں کے بیچ بیٹھ جاتیں تو وہ جلد ہی کوئی بہانہ کر کے کھسک جاتے! یہ صورت حال انھیں سخت ناگوار گزرتی۔ فیاض نے ان کی شکایت سن کر کہا تھا۔

ان کی والدہ نے اپنی بھانجی کو ان سے منسوب کر رکھا تھا۔ انھیں اپنی بات کے گرنے کا غم ہے۔ رفتہ رفتہ جب یہ احساس زائل ہو جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ احساس زائل نہ ہوا۔ آپس کی شکر رنجی اختلاف گہرا ہوتا گیا۔ ہاجرہ میں قوت برداشت کم تھی۔ وہ کسی کی کچھ سن گن لے بھاگتیں اور گھر میں خوب مہابھارت مچتی۔ فیاض اس کھینچا تانی سے برگشتہ رہنے لگے۔ ادھر ماں باپ اور بہنیں ان سے ہاجرہ کی شکایت کرتے۔ اور اکیلے میں ہاجرہ ان پر امڈ جاتیں۔ وہ کسی کی طرف بول نہ سکتے۔ لیکن پھر وہ بیوی ہی پر ناراض ہونے لگے سسرال آئے سات آٹھ مہینے ہوئے تھے کہ ان کے ہاں پہلا لڑکا ہوا تب خاندان بھر میں ایک پوشیدہ ہنگامہ مچ گیا۔ سب کا خیال تھا کہ یہ بچہ جائز نہیں تھا۔ اسے اس کے ماں باپ کے سوا کوئی چھوتا بھی نہیں تھا اس کی پیدائش نت نئے جھگڑوں اور جگ ہنسائی کا باعث بن گئی۔! ساس سسر اب بہو کو اپنے ہاں رکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ فیاض نے بھی علانیہ بے رخی شروع کردی تھی۔ ہاجرہ کی حالت پر دوگونہ عذاب تھا۔ نہ سسرال میں جگہ نہ میکے میں۔ انھوں نے فیاض کو مجبور کرکے ایک گھر لے لیا۔ لیکن یہاں کا خرچ آسان نہ تھا فیاض نے پارٹ ٹائم جاب کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ تیس سی آمدنی تین نفوس کے لیے کافی نہ تھی۔ جیسے تیسے دن گزر رہے تھے کہ ان کے ہاں دوسرے بچے کی آمد آمد ہوئی۔ فیاض کی بے رخی چڑچڑاپن اور دل آزاری کی عادت عروج کو پہونچ گئی تھی۔ وہ چار چار دن گھر سے غائب رہتے۔ ہاجرہ کی آنکھیں اب کھلیں

مگر بے فائدہ۔ وہ آٹھ آٹھ آنسو روتیں۔ عادت پڑی ہوئی تھی
زبان درازی کی۔ ان کی زبان چلتی اور فیاض کا ہاتھ چلتا۔ زندگی
دوزخ بن کر رہ گئی۔ مزید غضب یہ ہوا کہ مہاران پور سے فیاض
کی بڑی بہن ماں باپ سے ملنے آئیں۔ نجانے انھیں ماں نے کیا کیا
لکھ کے بھڑکایا تھا کہ وہ ہاجرہ کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ
ہوئیں بلکہ بھائی کو طرح طرح سے لعنت ملامت کی۔ ہاجرہ پر نئے
نئے الزام رکھے جو تیز طرار لڑکی ایک مرد کو لبھا رجھا سکتی ہے اس
کا کیا اعتبار۔ یہ کہیں وہ کسی اور مرد سے بھی پھنس سکتی ہے۔ انھیں
آوارہ، بدچلن، بدکردار بنایا۔ ان کے بچوں کو اپنے بھائی کی اولاد
ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ہاجرہ کے خلاف ایک طاقت ور محاذ تیار
تھا۔ ایک طرف پوری سسرال۔ زبان کے تیز، موثر ہتھیاروں سے
لیس۔ دوسری طرف صرف ہاجرہ۔ چھوٹے بچوں کا کچا ساتھ۔ زبان
کے ہتھیار مسلسل استعمال سے کند ہو چکے تھے۔ ان کا پلہ کمزور تھا۔
اب وہ زبان کی بجائے آنسو استعمال کر رہی تھیں۔ آنسو۔ جو ریاکار
مکار اور چالاک عورتوں کا آخری حربہ ہیں۔ وہ بھی سب پر
قطعاً بے اثر رہے۔ بڑی بہن جو سارے جگ کی بیا کہلاتی تھیں
کسی طرح ہار ماننے فیاض کو معاف کرنے اور ہاجرہ کو خاندان میں
شامل کر لینے پر تیار نہ تھیں ان کے مطالبات سب کے نزدیک قابل
قبول تھے۔ فیاض نے بڈھی ماں اور کمزور باپ کا حکم نہ مانا تھا ماں کو
خاندان بھر میں شرمندہ کیا تھا۔ ایک معصوم اور انجان لڑکی کو عرصہ
تک منگیتر رکھا تھا اور پھر اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ سارے میں

بدنام ہو رہی تھی۔ اس کا کوئی رشتہ دکھائی نہ آ رہا تھا لہٰذا ان تمام
فسادوں کا ذمہ دار ہاجرہ کو ٹھہرا کر انھوں نے فیاض پر زور دینا شروع
کیا کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ سویرا ہے۔ تین سال کون سا بڑا عرصہ
ہے وہ ہاجرہ کو طلاق دے کر اماں کی بھانجی شبنم کو بیاہ لائیں۔
فیاض نے کمزور سا عذر کیا تھا۔

"بیا۔ چھوٹے چھوٹے میرے دو بچے۔ مطلب یہ کہ انھیں لے کے
وہ کہاں جائے گی" بس بیا بارود کے قلعہ کی طرح پھٹ گئیں "
بے غیرت بے شرم۔ تجھے کیا خبر کہ وہ غلیظ کیڑے تیرے ہی ہیں
نجانے کس کی گندگی کس طرح تیرے سر تھوپی ہے کہ انھیں اپنے
بچے کہنے لگا ہے۔ اتنا سوچ بدبخت کہ جب وہ مجھ سے دیدے لڑا
کر تیرے ساتھ آ گئی ہے تو اسی طرح کسی اور سے بھی آنکھیں ملا سکتی
ہے۔ کیا تو ہر وقت بستر پر بیٹھا رہتا تھا۔ ایسی ہوائی دیدہ
شوخ چشم بدکردار لڑکیوں کا کیا بھروسہ۔ نہیں بھیا۔ میں نہ
مانوں گی جب تک تو اسے طلاق دے کر آزاد نہیں کر دیتا۔ اور
میں تیرا بیاہ شمو سے نہیں کر دیتی۔ اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔!"

"کیا جواب دوں گا میں ہاجرہ کو" فیاض نے بوکھلا کر کہا "یقین
کیجئے کہ اسے اس انقلاب کا پتہ چلے گا وہ یہاں آ کر حشر اٹھا دے
گی!۔ تب آپ کیا کریں گی"

"بو دیکھو بٹو کہ جانے کون سی بوٹی گھس کے چٹا دی ہے کہ
چوہے کی طرح اس کا نام لیتے دبکتا ہے" اماں نے دہائی دی۔
تیز طرار آفت کی پرکالہ بہادر بیٹی سے بڑی مضبوطی ہو گئی تھی۔ بیٹی

ماں کو بہت چاہتی تھیں۔ انھوں نے پھر گرج برس کر ریاض کو شرابور کر دیا۔

"اماں کی تم نے خاندان میں ناک ہی نہ رکھی۔ پرسوں نرسوں منتن کے بچے کی سالگرہ میں گئی تھیں۔ ادھر آپا خالہ منہ تھتھائے رہیں ادھر اماں نادم و شرمندہ کونے میں منہ چھپائے بیٹھی رہیں۔ دونوں بہنوں میں نفاق سا کیسے پڑا ہے۔ صرف تمہاری تن مانی اور بدمعاشی کی وجہ سے۔ کیا تمھیں اماں کا دل دکھانا اچھا لگتا ہے۔؟"

"حق مہر کیا ہے اس موئی کا؟" اماں نے پوچھا۔

"پانچ ہزار۔" مری ہوئی آواز میں ریاض نے کہا۔

"جہیز بھی لائی تھی؟" اپی بیا نے دریافت کیا۔

"ہاں۔!" ریاض نے پھر لمبی سانس لی۔ ان کے خیالوں میں ڈھائی سال کا شبیر اور تین ماہ کا جبیر کلبلایا تھا!۔

"جہیز کا تنکا تنکا دوسرے گھر بٹور لے گئی" اماں نے اطلاع دی "پتیل کی ٹھلی میں چھید ہو گیا تھا وہ تک نہ چھوڑی۔!"

"صدقہ گیا" بیا نے حاتم بن کر کہا "اب تم پانچ ہزار اس کے منہ پر دے مارو اور واپس آؤ اماں کی طرف۔ کیسے بیٹے ہو مراد جلے جلاد۔ تین بہنوں کے ایک بھائی۔ مٹی پڑے۔ منتوں مرادوں کے۔ پتہ ہوتا کہ آگے گویا دغا ہونی ہے تو اماں باوا بیٹے کی دعا ہی نہ مانگتے! ایسی کلیجہ چبانے والی اولاد بھی کس کام کی۔!"

اماں نے ایک اور پینترا بدلا "یا اگر ماں باپ بہنوں سے زیادہ پیاری ہے تو جائیں اسی کے پاس۔ پھر نہ میری شکل دیکھیں نہ ملیں روادار

ہوں گی ان کی صورت پر نظر ڈالوں۔ آپس کے مرے جئے پر بھی کوئی نہ آئے۔ بس، میں صبر کر لوں گی میں نے بڑھاپے کا سہارا بیٹا پیدا ہی نہ کیا تھا!"

اماں آپ کی باتیں" بیا نے بھڑک کر کہا: "اسی کمزوری نے انھیں شیر بنا رکھا ہے۔ آپ چپکے چپکے رو یا کیں۔ بدزبان ٹڑی کے تیز تیز جواب سنا کیں۔ اور کچھ نہ کیا میں ہوتی نہ آپ کی جگہ تو تبھی ایک وار میں معاملہ برابر کر دیتی۔ یہ منحوس مار تسمہ لگا ہی نہ رہتا!" پھر انھوں نے نہایت فراخدلی اور سیر چشمی سے کہا: "تمھارے پاس پانچ ہزار ہی گنت نہ ہوں گے۔ میں دے دیتی ہوں۔ طلاق نامہ اور چیک تیار کر کے رجسٹری سے بھجوا دو۔ اس تاکید کے ساتھ کہ خبردار ہلا مچاتی یہاں نہ آئے اب یہاں میاؤں میاؤں کرنے والی اماں سے سابقہ نہیں پڑے گا بھوکی شیرنی کا سامنا ہو گا۔ تو ختی چبا ڈالوں گی۔ سمجھے۔ اس طرف سے نجات ملے تو میں اور اماں جائیں۔ امانی خالہ کے ہاں۔ میں ہاتھ پاؤں پڑ کے انھیں شبنم کے لیے راضی کر لوں گی۔ رجب کا مبارک مہینہ بھی ہے بس تھوڑی سی تیاری کے بعد جاگنے کی رات سے پہلے پہلے یہ کام ہو لے اماں کے دل کو سکون ہو۔ صورت پر بحالی آئے تو پھر میں بھی سہار پنور جاؤں۔ ناگ سانپ کے آٹھ سپنولیے ادھر بھی تو ہیں۔ بادو افضال کا ان پر بس نہیں چلتا۔ یکبارگی لٹھ لے کے پل پڑتے ہیں۔ خدا غارت کرے۔ قرار نہ مجھے یہاں نہ سکون وہاں۔ کیا مصیبت ہے!"

اور پھر بے کس دبے بس ہاجرہ پر بے خبری میں ظلم ڈھایا گیا۔ نیاض کو سب نے گھیری پر روک رکھا تھا طلاق نامہ مہر کا چیک رجسٹری سے ہاجرہ کو بھجوا دیا گیا

فیاض کے والد کو یہ کارروائی پسند نہ تھی۔ انھیں احساس نہ تھا کہ ایسے جذباتی تماشے میں مرد عورت برابر کے شریک ہوتے ہیں، اکیلی عورت قصوروار نہیں ہوتی لیکن وہ دائم المریض، اور بڈھے تھے۔ ان کی شنوائی کیا ہوتی! بس تو فیاض کا بھی نہیں چلا۔ اگر ان کی مرضی ہوتی تو وہ یہ ظلم ہاجرہ پر نہ ہوتا۔ مگر اب وہ بھی روایتی مردوں کی طرح دوسری لڑکی سے وابستگی کا لطف لینے لگے تھے۔ وہ کیا زندگی تھی۔ خانہ داری کا چکر۔ پیٹ پالنے کی فکر، بیوی سے لڑائی، بچوں کی جھک جھک ان کی نامعلوم بیماریاں، ڈاکٹروں کے در کے پھیرے۔ کوئی رومانیت، دلچسپی، شگفتگی نہ تھی۔ انھیں بخوبی علم تھا کہ ہاجرہ کے بچے صدفی صد انہی کے اولاد تھے۔ مگر جان بوجھ کر انھوں نے خود کو باور کرالیا کہ وہ بچے صرف ہاجرہ ہی کے تھے۔! اور اپنی بھیانک غلطی، گناہ کبیرہ پر ضمیر کی چیخ پکار کے باوجود مطمئن ہو گئے!

سب نے سکون کی سانس لی۔! پھر کسی کو بدنصیب عورت اور بدقسمت بچوں کی یاد نہ آئی۔ ماں اور بہنوں نے چاروں طرف سے فیاض کو جکڑ لیا تھا۔ بہن نے بڑی ہوشیاری سے انھیں شبنم کا دیدار کرا دیا تھا۔ فیاض ریشہ خطمی ہو گئے۔ ماں نے اپنی بہن سے معافی مانگی تھی۔ غلطی فیاض کی تھی، ان کی نہ تھی لہذا بہن نے بھی مصلحتاً دوسری بہن کو معاف کر دیا۔! اور دنیا کے ارادے کے مطابق جانے کی رات سے دو دن قبل فیاض اور شبنم کا نکاح ہو گیا۔ تھوڑا سا کھٹکا یہ لگا تھا کہ شاید ہاجرہ کے باپ بھائی وغیرہ اس ظلم پر احتجاج کرنے ان کے ہاں آ دھمکیں۔ لڑائی جھگڑا ہوگا۔ مار پیٹ ہوگی۔ سو بیانے یہ ترکیب کی تھی کہ بچے

جاتے اپنے ساتھ فیاض اور شبنم کو لیتی گئیں۔ سہارنپور میں ان کا قیام
کہاں تھا یہ ہاجرہ یا اس کے ماں باپ کو کیا معلوم تھا۔ لہٰذا فیاض ہر
طرح سے محفوظ ہو گئے۔ شبنم کی رفاقت میں وہ جلد ہی ہاجرہ اور اپنے
بیٹوں کو بھول بھال گئے۔ زندگی میں ایسے معمولی واقعات تو ہوتے
ہی رہتے ہیں۔ ان پر زیادہ دیر تک سوچنا اور دماغ تھکانا بے فائدہ
تھا۔

شروع میں تو ہاجرہ کو یقین ہی نہ آسکا کہ فیاض نے یہ مذموم و
رکیک حرکت کی ہے۔ وہ اپنے سامنے سارے حقائق کو دیکھتے ہوئے بھی
باور کرنے کو تیار نہ تھی کہ وہ ایک بھیانک حقیقت تھی! اور جب ان کے
حواس درست ہوئے تو ایسے ہوئے کہ شاید بدحواسی ان پر طاری ہو گئی
ان کی نگاہوں میں زمین آسمان ساکت، دنیا جہنم اور اپنا وجود نفرت و
کراہیت کا باعث بن گیا۔ وہ بچے جو ان کے جسم کا ایک حصہ تھے۔ اب جسم
سے لگے ناسور معلوم ہونے لگے! اس وقت کوئی نہ تھا جو انھیں سہارا
دیتا، سمجھاتا، تسلیاں دیتا یا پامردی کے ساتھ جینے کا حوصلہ بندھاتا۔
انھوں نے خود کو میکے اور سسرال سے ہر طرح الگ پا کر یکقلم اپنی اور بچوں
کی زندگیاں ختم کرنے کا اٹل فیصلہ کر لیا۔ ان کی حالت عجیب تھی۔ کبھی
وہ چیخیں مار کر روتیں۔ کبھی فیاض کو کوستیں اور کبھی بچوں کو پیٹ
دیتیں۔ ساری حرکتیں مذبوحی تھیں۔ اتفاق سے انھوں نے ہمسائی

کے ایک لڑکے کو جز وقتی ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ یہ ساری حرکتیں دیکھ رہا تھا اور ان کے دکھ سے آگاہ تھا۔ ان کے منہ سے نکلے خوفناک فقروں کو بھی سن رہا تھا۔

"بچوں کو مار ڈالو نگی خود بھی مر جاؤنگی"

وہ اپنے اس خونی اقدام پر آمادہ بھی معلوم ہو رہی تھی۔ لڑکا جس نے کبھی تذکرۃً ان کے والدین کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ وہ ان سے کہے بغیر ان کے گھر اطلاع دینے دوڑا گیا اور بڑی بدحواسی میں اتنا کہا تھا۔

صاحب نے انھیں طلاق دے دی۔ اب وہ بچوں سمیت کنوئیں میں پھاندنے والی ہیں۔ جلدی چل کے بچا لیجئے ورنہ وہ پھاند چکی ہوں گی"

سید صاحب اور عدیل ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر لڑکے کے ساتھ دوڑ گئے تھے۔ تین ساڑھے تین سال بعد بیٹی کو دیکھا اور کس حال میں دیکھا کہ جیسے کہ کوئی پاگل عورت ہو۔ میلا کچیلا لباس، الجھے ہوئے بال، ماتھے پر بیچ زخم، پھٹی ہوئی آنکھیں۔ ہانپتی ہوئی سانسیں۔

ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل کا کنستر اور دوسرے ہاتھ میں دیا سلائی کی ڈبیہ۔ سامنے دونوں بچے تھے۔ دو ڈھائی سال کا ننھا سا بچہ ماں کو تک رہا تھا اور ننھا ننگے تخت پر بیٹھا تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس خوفناک حقیقت سے بے خبر ماں ان پر تیل چھڑک کر آگ دکھانے والی تھی۔

باپ اور بھائی کو دیکھ کر ڈبہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ایک گھٹی ہوئی سی چیخ ان کے منہ سے نکلی اور وہ باپ کے قدموں پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔

ہوش اپنے گھر میں آیا۔ آرام دہ بستر پر۔ آس پاس ماں باپ۔۔۔ بہن بھاوجیں حتی کہ گھر کے ملازمین تک موجود تھے۔ ان کی شکلوں پر نظر پڑی تھی

کے آنکھوں کے پیچھے سے سمندر ابل پڑا۔ دل بھر کر رونے سے طبیعت ہلکی ہو گئی۔ کسی نے رونے سے منع نہیں کیا۔ فی الحال یہی ایک علاج تھا۔ انھوں نے کسی کے پوچھنے سے پہلے ہی ہچکیاں اور سسکیاں لے کر اپنی تباہی کی داستان سنا دی۔! ان کا خیال تھا کہ سب لوگ فیاض پر لعنتوں کے ڈونگرے برسائیں گے۔ انھیں ان کی خود رائی پر برا بھلا کہیں گے۔ لیکن یہ کچھ نہ ہوا۔ سید صاحب نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

"زندگی انہی تکالیف کا نام ہے بیٹی۔ یہاں سکون سے ایک ہموار انداز میں کون جیتا ہے۔؟ تمھیں ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ بہت برا اقدام کر رہی تھیں تم۔ خود تو تم عذابِ دائم کی مستحق ٹھہرتیں۔ ان معصوموں کا خون بھی تمھاری گردن پر ہوتا۔ مطلب یہ کہ راندہ درگاہ۔ ابد تک کے لیے اب تم سب کچھ بھول جاؤ اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔!"

میں پہلے ہی کہتی تھی وہ موا بھاڑ ڈالا ایمان خور صورت ہی سے ڈاکو لگ رہا تھا۔ بیگم نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔ "نجانے میری بھولی بھالی بچی کو لیونکر!"

سید صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیا۔ "اب ان باتوں کا کیا حل ہے! دھوکا سبھی کھاتے ہیں یہاں کوئی فرشتہ نہیں۔ اچھا بیٹی۔ وہ مکان کیا تمھارا اپنا ہے یا کرائے کا۔ خاصہ معقول سامان میں نے دیکھا تھا اس میں۔!

"کک۔ کرائے کا ابی جی۔!" سخت ترین شرمندگی محسوس کرتے ہوئے ہاجرہ نے کہا۔ "وہ سامان۔ البتہ میرا ہے۔ آپ نے جو جہیز۔!"

سید صاحب نے پھر بات کاٹ دی۔ "تو بھی۔ شکیل میاں زحمت کریں ساتھ غفور کو لے لو۔ جو کرایہ بنتا ہے۔ ادا کر کے سامان لے آئیں۔ اب انشاءاللہ تمھیں یہیں رہنا ہے۔"

کہیں نگوڑا مردے نکلا بچوں کا مطالبہ کرنے جو آئے۔" بیگم نے پھر کہا۔
"ٹانگیں توڑ ڈالوں گا اگر بدبخت نے یہاں قدم بھی رکھا۔ عدیل نے غرا کر کہا۔

"ملعون انھیں اپنے بچے مانتا ہی نہیں، تو مطالبہ کس منہ سے کرے گا؟"
جمیل نے کہا۔ بہرحال سب نے بیدصاحب کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود نیاض پر لعنت ملامت کی بارش برسا دی۔ مطلب یہ بھی تھا کہ ہاجرہ کے دل سے ملال دور کیا جائے۔ وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ مزید برآں ہاجرہ خود بھی جو غم کسی کی عورت تھیں۔ انھیں نیاض پر اس قدر غصہ تھا کہ سب کی ملامت حق بجانب لگ رہی تھی۔ پھر بھی اس مرتبہ ان پر اثر بہت زیادہ ہوا۔ وہ لاپرواہی بےحسی اور بااثر پذیری کی عادت مر دہ ہوتی۔ انھیں ایک چپ لگی تھی۔ تین تین افراد کی پرورش بھائی اور باپ بیٹے کیسے کر سکیں گے۔ وہ خود کیونکر گوارہ کریں گی کہ سب پر بوجھ بن کر پڑ جائیں۔ لیکن ان کا سامان لے آئے تھے۔ اور بیگم نے گھر کا بہترین بڑا کمرہ ان کے لیے الگ کر دیا تھا۔ چند ہفتے دل کو بہلانے میں گزرے۔ پھر ہاجرہ نے سوچا کہ اپنی تعلیم کو کام میں لائیں۔ انھوں نے بھاوجوں کی تمسخر آمیز نگاہوں سے بچنے کے لیے ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ مگر وہ دم خم باقی نہ رہا تھا۔ زیادہ تر وقت ماضی کی یادوں کے سہارے گزرتا۔
نیاض کی شخصیت، ان کی عارضی محبت، وہ عہد و پیمان، بھولنے والی باتیں نہ تھیں۔ کالج کے زمانے کی دلکش یادیں، وہ چمن کا سرسبز گوشہ، گھنے درختوں کا ٹھنڈا سایہ۔ کسی ندی یا جھیل کے کنارے محبت کی باتیں۔ شادی کے بعد کا مدہوش زمانہ اور پھر۔ تلخیوں کا آغاز۔ ان کی جگر کا دی کے لیے نشتر و خنجر

ان گنت تھے۔ اور قطرہ قطرہ لہو آنسوؤں کی شکل میں رِس بھی رہا تھا۔
تھوڑے ہی عرصہ میں غمِ پنہاں نے انھیں کھوکھلا کر دیا۔ طاقت و حوصلہ جواب
دے گیا۔ عزم و توانائی کا نام بھی نہ رہا۔ نہ خود سے دلچسپی باقی تھی نہ بچوں
سے۔ بچوں کو چھوٹی بہن عاصرہ اور امی ہی سنبھالتی تھیں۔

انھی دنوں ایک اور ہمالیہ ہاجرہ کی ذات پر ٹوٹا اور انھیں چکنا چور کر
گیا۔ وہ جب فیاض سے علیحدہ ہوئیں تو ان کا بچہ جبیر تین چار ماہ کا تھا۔
تھوڑے دنوں بعد یہ ستم انگیز حقیقت ان پر عیاں ہوئی کہ وہ فیاض کا
آخری تحفہ اپنے ساتھ لے آئی تھیں لیڈی ڈاکٹر نے تصدیق کر دی۔ طبیعت کا اضمحلال
اور مفروضہ بیماری کوئی پریشان کن بات نہیں۔ وہ تیسری بار ماں بننے والی
تھی!۔ اس خبرِ وحشت اثر نے انھیں زندہ درگور کر کے رکھ دیا۔! ماں کی
گود میں سر رکھ کر وہ بہت بے چین ہو کر روئیں۔!

"امی۔ گناہ ثواب کا خیال نہ کیجیے۔ مجھے اس ناپاک بوجھ سے نجات دلوائیے
مجھے نہیں چاہئیں یہ بچے۔ میری جان کا عذاب ہیں۔ امی انھیں یتیم خانے میں
جھونک دیجیے۔ میں بھی گھر سے جاؤں گی کسی درگاہ یا خانقاہ کا گوشہ سنبھال
لوں گی۔ امی۔ یہ کیا ہے زندگی۔ ہائے مجھے آپ کی نافرمانی کی یہ کیسی سزا ملی
ہے۔ امی۔ میری امی۔ میں کیا کروں!"

ان کی بے قرار گریہ و زاری نے ماں کو بھی رُلا دیا ——— بنائے کچھ نہ بنا
سید صاحب بے چارے اس خبر سے کچھ دم بخود سے رہ گئے! کیا ہوگا ہاجرہ
کا۔ خود بیمار، تین بچوں کا بار، بھائیوں کا کیا بھروسہ، بھاوجیں اپنی کب
ہوتی ہیں۔ ماں باپ بڈھے ہوئے۔ ہاجرہ فکر و غم کے ہجوم میں زندہ مردہ برابر
تھیں۔ اگر ان کی ماں بہن اور بھائی وقتاً فوقتاً تسلیاں دیتے اور ہمت نہ بندھاتے

رہتے تو شاید وہ جی سے گزر رہا تھیں اس وقت ان کی بڑی بھاوج نے ان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنا کوئی سالڑکا انھیں ہمیشہ کے لیے دے دیں تنس کر بولی تھیں۔

"بی بی تم بچوں سے اتنی بے زار ہو۔ مڑ کر دیکھتی نہیں ہو بے چارے ماں کو امی جی اور عامرہ پر پل رہے ہیں۔ اللہ نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا جیو یا شبیر کو مجھے دے کر پکا کاغذ لکھوا لو۔ میں اپنی اولاد بنا کر پالوں گی۔ تمہیں شکایت نہ ہوگی کہ میں نے اس کا خیال نہ کیا۔ مجھ پر بھروسہ نہ ہو تو نہ سہی۔ اپنے ترسے ہوئے بھائی ہی پر رحم کرو۔!"

دونوں بچے آپ کے ہیں بھابی۔ لے لیجئے پال لیجئے۔ بچے اور پکے کاغذ پر تحریر لکھوانے کی کیا ضرورت ہے:" ہاجرہ نے خشک سا جواب دے دیا۔" بچے کسی پر بوجھ نہیں ہوتے بھابھی آج میرے دن اُلٹے آرہے ہیں مگر کل کس نے دیکھا ہے۔ کیسا وقت کیسا ہو تب گیا، یہ بچے مجھے سہارا نہ دیں گے!"

"میں نے پہلے ہی عدیل صاحب سے کہا تھا کہ ہاجرہ کو منظور نہ ہوگا۔" بھابھی نے قدرے برہمی سے کہا۔" سچ ہی تو ہے۔ اپنے بچے کون کسے سونپتا ہے چاہے وہ کیسے بھی ہوں۔!"

"ایک زہریلا تیر سا ہاجرہ کے دل میں پیوست ہو گیا" کیا مطلب ہے۔ کیسے بچے؟ آپ انھیں کیا سمجھتی ہیں۔!"

"میں کیا سمجھتی۔ تمھاری داستان سنی تھی۔!" وہ بولیں۔

ہاجرہ کو غصہ آگیا" ٹھیک ہے۔ غیر قانونی بچے آپ لیجئے بھی نہیں، ان کا بار آپ پر نہیں ہے۔ بھائی جان سے کہہ دیجئے وہ ہم پر ایک

پائی بھی صرف نہ کریں۔"

بھابی کو بھی طنطنہ آگیا تھا مگر خاموش ہوگئیں۔ اتنا بے شک ہوا کہ منافرت اور اختلاف کی خلیج درمیان میں گہری ہوگئی۔!

ہاجرہ کا کام اب صرف یہی رہ گیا تھا کہ ہر وقت اپنے نصیب کو کوستی رہیں! کبھی قسمت کو برا بھلا کہتی رہیں یا پھر پچھلی یادوں کے مزار پر آنسوؤں کے پھول چڑھائیں۔ ایک ایک لمحہ ان کی زندگی کا گراں بار تھا۔ اپنی ذات کے سوا انھیں اپنے ہونے والے بچے سے بھی دشمنی ہوگئی تھی۔ بد دعائیں دیا کرتیں! آنے والا ابھی ادھر ہی جائے اور ساتھ میں انھیں بھی لیتا جائے! پل پل گزرتے بالآخر ایک دن ان کی آغوش میں ننھی منی خوبصورت سی بچی آگئی۔ کیا تو وہ اس سے متنفر اور برگشتہ تھیں۔ کیا تو یہ عالم ہوا کہ بچہ کی شکل دیکھی اور سارے غم خوشیوں سے بدل گئے۔ بچی آفتاب کی ایک شعاع تھی۔ اس کے نمودار ہوتے ہی غموں کا کہر چھٹنے لگا تھا۔ انھیں رفتہ رفتہ ادراک ہوتا گیا کہ خود کو پریشانیوں کے حوالے کرکے بچوں کے حق میں بے دردی کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ وہ گم صم بیلے دبے اور فکرمند تو اب بھی رہتی تھیں۔ مگر یہ جذبے اب تخریبی نہیں تعمیری تھے۔ انھوں نے پھر ایک مدرسہ میں نوکری تلاش کرلی اور تندہی سے محنت پر جٹ گئیں۔ انھیں بچے پالنے تھے۔

زمانے کے پل بھاگتے رہے۔ شبیر اور جبیر اب بڑے ہوگئے تھے۔ شبیر گیارہ سال کا تھا۔ جبیر نو سال کا اور صنوبیہ سات سال کی۔ غموں کی دھول ہاجرہ کے چہرے سے دھل چکی تھی۔ وہ اب بھی کم عمر اور حسین لگتی تھیں۔ ان کے بچے بھی خوبصورت تھے۔ خصوصاً صنوبیہ حسن و نزاکت

کا ایسا پیکر تھی کہ اتنی نوعمری میں اسے جو بھی دیکھتا دیکھتا رہ جاتا۔

اس دوران میں ہاجرہ کے ماموں جو دہرہ دون میں رہتے تھے۔ وہ بہن سے ملنے آئے اور دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اب وہ اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ ہر ماہ ہاجرہ ان کے نام ایک ہزار روپیہ ہمیشہ سے بھیجا دیتیں۔ سات سو ان کے اور صنوبیہ کے لیے کافی تھے۔ کچھ نہ کچھ پس انداز بھی ہو رہا تھا۔ اب انھیں اپنا دکھ دینے والا ماضی یاد نہ تھا۔ یہ تک خبر نہ تھی کہ نیاز کہاں تھے کس حال میں تھے۔ ان کے نام و تذکرے سے انھیں نفرت تھی۔ لڑکوں کو بھی انھوں نے اپنے حالات سے واقف کرا دیا تھا۔ بچے آخر ایک غصہ ور جذباتی ماں کے تھے۔ وہ باپ سے انتقام پر آمادہ ہو جاتے اور نفرت نے ہاجرہ کو انتقام پر جو ابھارا تھا تو اسی لیے کہ وہ یا ان کی اولاد باپ سے پل پل کا بدلہ لیں۔ جرأت ان کی فطرت میں شامل نہ تھی۔

صنوبیہ ان کی سیرت کے برعکس نکل رہی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں وہ ہمدرد رحمدل اور نیک تھی۔ اسے بھی اپنی ماں کی زندگی کی کہانی معلوم تھی مگر کسی جذبے نے اسے بدلے پر نہیں ابھارا تھا۔ اس نے بڑی ایمانداری سے سوچا تھا اگر ممی اپنی ماں کا کہنا مان لیتیں تو برباد ہونے سے بچ جاتیں۔ اس کے طرز فکر نے ہاجرہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اگر یہ ایسے ہی ٹھنڈے مزاج کی تھی تو کسی بھی زیادتی پر احتجاج نہ کر سکے گی۔ وہ اسے معاندانہ خیالات پر ابھارا کرتیں۔ صنوبیہ نے اپنی عادت نہ بدلی۔ ہر بات صاف صاف کہہ نکلتی تھی۔ چاہے اس کے نتیجے میں اسے کتنا ہی سخت سست کیوں نہ سننا پڑتا۔ وہ زبان کی نجیب تھی۔ اپنی مرضی اور پسند کی پابند۔ جو دل میں آتا وہی کرتی۔ ابھی سے ضدی اور سرکش تھی ہاجرہ

کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اپنی ددھیال کی طرف نہ ہو جائے۔ ان کے بہکانے پر اس نے جواب دیا تھا۔

"آپ کہتی ہیں ساری دنیا خراب ہے۔ میری دادی، پھوپھیاں اور ڈیڈی بھی خراب آدمی ہیں تو پھر ممی اس دنیا میں اچھا کون ہے؟"

"دماغ سے سوال نہ کریدا کرو۔" ہاجرہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم بچی ہو۔ تم کو ابھی کیا معلوم کون کیسا ہے۔ جیسا میں کہوں وہ مانا کرو۔!" انھوں نے دوسرا رخ اختیار کر کے اسے لاجواب کرنے کی کوشش کی۔ "تمھارے ظالم جلاد منحوس باپ نے کبھی مڑ کے پوچھا ہے تمھیں یا تمھارے بھائیوں کو مرتے ہو کہ جیتے ہو۔ کیسی گزر رہی ہے۔ کس طرح پڑھ لکھ رہے ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم بیٹی کہ تم لوگوں کو پالنے پوسنے میں میرا کیا حال ہوا ہے۔ یہ کام جو میں کر رہی ہوں وہ تو تمھارے باپ کا تھا۔!"

"تو پھر مجھے باپ کا پتہ بتائیے۔ میں ان کے پاس جاؤں گی اور کہوں گی کہ جو کام آپ کا ہے وہ کیجئے۔ ممی اب بہت تھک گئی ہیں!"

"تم میرے دشمنوں میں جاؤ گی صنوبیہ!"

"دشمن کیسے ہوئے ممی۔ وہ تو میرے باپ ہیں نا!"

"صنوبیہ!"

"ممی میں کچھ کہہ رہی ہوں کیا؟"

"پھر کبھی مجھ سے ایسی الٹی سیدھی بکواس نہ کرنا!"

"اچھا ممی۔"

"باپ نامراد کا نام زبان پر نہ لانا۔"

"نہیں لاؤں گی ممی!"

میں کہہ چکی ہوں کہ انجمیں بھائی ہی تمھارے باپ کی جگہ ہیں!۔
ہاں ممی۔ یہ تو آپ بہتیری بار کہہ چکی ہیں۔ مجھے یاد ہے۔ میں سب سے کہتی ہوں کہ وہی میرے باپ ہیں!"

حالانکہ وہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ مگر ہاجرہ کو اس کے مستقبل کی فکر بے چین کیے رہتی۔ لڑکی ذات جاڑے کی دھوپ ہے۔ ابھی نمودار ہوئی ابھی پھیلی بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈھل گئی۔ انجمیں کی بیوی شنازیہ نے اکثر مذاق میں کہا تھا کہ یہ تو میری ننھی منی سی بھاوج ہے۔ ارقم ان کا سب سے چھوٹا نازپرور وہ بھائی تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ صنوبیہ ان کے بھائی سے بیاہی جائے۔ مال و زر لائے چاہے نہ لائے۔ اس کا معصوم حسن ہی ایک بڑی دولت تھا۔ انھوں نے اتنی بار یہ بات دہرائی تھی کہ ارقم کے کچے ذہن میں اتر کر یوں جذب ہوئی تھی جیسے کچی مٹی میں پانی۔ وہ تیز طرار اور ہوشیار لڑکا تھا۔ اس نے کچھ اور نظروں سے صنوبیہ کو دیکھنا شروع کیا تھا۔ جیسے ابھی سے اس پر اپنا حق رکھتا ہو۔ وہ اس کے آگے پیچھے پھرا کرتا۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ اس کے ساتھ اس میں کھیلنے اور معنی خیز باتیں کرنے کے مواقع تلاش کرتا۔ اس پر حکم چلاتا۔ لیکن جتنا جتنا وہ اس کے قریب کا متمنی رہتا تھا۔ صنوبیہ کا گریز اسی قدر بڑھتا جاتا۔ اس کا حاکمانہ لہجہ، احساس برتری اور اس کی عمر سے بالاتر باتیں اسے پسند نہ تھیں اور پھر صورت حال بد سے بدتر اس لیے ہوگئی کہ وہ ایاز کو پھوٹی آنکھ نہ دیکھ سکتا۔ صنوبیہ ایاز کی خاکساری، عاجزی کی وجہ سے اس کے قریب ہوتی گئی اور ارقم کی علانیہ دشمنی اب ڈھکی چھپی دشمنی اور انتقام پر آگئی۔

پہاڑی جنگل کے بادلوں سے آسمان گدلا ہو رہا تھا۔ مغربی افق سے عجیب گہرا ابر آہستہ آہستہ ابھر کر چہرہ فلک کا نقاب بنتا جا رہا ہے اور طوفانی بارش کی پیش گوئی کر رہا تھا! ہواؤں کے دل رکے ہوئے تھے۔ چاروں طرف ایک پر شور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ فضا میں لرز رہی تھی، جیسے آواز نہیں تھی مگر محسوس کی جاتی تھی۔ سرشام کا منظر بہت جلد ہی تاریکی میں ڈھل گیا۔ گاڑھی دھند میں تیز بلب بیمار کی ادھ کھلی ہوئی آنکھوں کی طرح جھپکا رہے تھے!

کمرے میں ٹھنڈا کہر پھیلا ہوا تھا۔ اور تاریکی تھی۔ ایاز کھڑکی کے نیچے کرسی پر بیٹھا آنے والے طوفان باد و باراں کا منتظر تھا۔ ایسا ہی طوفان اور ہولناک سناٹا اس کے دماغ میں بھی سنسنا رہا تھا! کچھ عجیب سی تردد و زود رنجی کی سی کیفیت اس پر طاری تھی! کبھی وہ برہمی کے عالم میں مٹھیاں بھینچ کر دانت پیسنے لگتا اور کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگتے!

اسے دوبارہ [illegible] صاحب کے ہاں آئے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے۔ آج کل صنوبیہ کے دونوں بھائی کسی چھٹی میں گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ کم و بیش ایاز ہی کی عمر کے تھے۔ مگر فطرت و سرشت میں عجیب سے۔ کسی بات کا تفاخر، احساس برتری، اپنی اعلیٰ تعلیم کا غرور۔ فراٹے سے انگریزی میں بات چیت کرنے کا خیال، انھیں جیسے سارے گھر سے برتر بنا رہا تھا۔ وہ خود کو کچھ سمجھ رہے تھے۔ صنوبیہ جتنی کم سخن، معصوم بھولی بھالی اور پر محبت تھی

میں تو یہی کہتا ہوں کہ بدنامی سے بچنے کے لیے ممی نے انہیں خود سے دور جھونک دیا ہے تو!

"ہاجرہ ۔ ؟" سید صاحب نے حد سے زیادہ حیران ہو کر کہا: "یہ میں کیا سن رہا ہوں ۔ چھوٹے منہ سے اتنی بڑی باتیں؟"

"ابی جی ۔ میں یہ صدمہ نہ سہار سکوں گی" ہاجرہ نیم مردہ ہو رہی تھیں "میرے نصیب میں سکھ نہیں ہے ۔ ابی جی ۔ یہ ان کم بختوں کو کس نے بہکا دیا ہے ۔ حد ہے کہ مجھ پر بہتان رکھ رہے ہیں ۔ میں نے بدنامی کے خیال سے انھیں دور جھونک رکھا ہے ۔ بدنصیب یہ نہیں سوچتے اپنی نامرادی کے خیال سے صبح سے شام تک ہڈیوں کا تیل نکالتی ہوں ۔ ان کے کھانے پینے کے لیے اچھے کپڑوں کے لیے ۔ کتابوں فیسوں کے لیے ہزار بارہ سو روپے بھجواتی ہوں ۔ ان بدمعاشوں کی نظر ان پر نہیں جاتی ۔ ابی جی ۔ یہ سارا کیا دھرا زاہدہ جمالی کا ہے ۔ کاش میں ان لوگوں کو یہیں رکھتی ۔ بلا سے آگے چل کے رکشا چلاتے یا قلی گیری کرتے ۔ میں یہ سب تو نہ سنتی ۔ اللہ ۔ یہ کیا ہوا ۔ اب مجھے ان لوگوں سے کیا امید ہے ؟"

"نگوڑے ذرا باپ کی فطرت پر جا رہے ہیں!" بیگم نے بھی حق ادا کر کے کہا: "ارے بیٹی تم کیوں ہڑبڑا کے مری مری ہوئی جا رہی ہو ۔ سمجھو سانپ کے سنپولیے پیدا نہیں ہوئے تھے ۔ بھجوا دو نسرین کو طبیب فیاض کے ہاں!"

"میں یہ بڑی بڑی بولیاں برداشت نہ کر سکوں گا" ندیم کو غصہ آ گیا۔

"منع کر لو انھیں ۔ ورنہ پھر میں جانتا ہوں کہ بدزبانوں کی زبان سیدھی کیسے کی جاتی ہے؟" وہ پہلے ہی اپنی بہن سے راضی اور خوش نہ تھے ۔ اب

تو انھیں ایک بہانہ ہاتھ آیا تھا۔ بہر حال جب لڑکوں پر لے دے ہوئی تو وہ بھی چپ ہو گئے!۔ ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا۔ دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے۔

برآمدے میں ایاز بیٹھا نرسری سے آئے ہوئے ننھے ننھے گملوں میں لگے پودوں کو بڑے گملوں میں منتقل کر رہا تھا!۔ اس نے انھیں دیکھا اور ان کی بات چیت سن کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ فرعون بے سامان تھے۔ لہٰذا ایک نظر ان پر ڈال کر وہ پھر ایک گملے کی مٹی برابر کرنے لگا!۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ دن اتوار کا تھا اور چونکہ مدرسہ کو چھٹی تھی لہٰذا صنوبیہ بھی وہیں بیٹھی تھی!۔ اور غالباً وہ بھی اس ہرے بھرے کام میں دلچسپی لے رہی تھی!۔ وہ اپنے بھائیوں کو دیکھ کر سہم گئی!۔ اور جلدی جلدی ہاتھوں سے مٹی جھاڑنے لگی!۔

"واہ بھئی۔ یہ بھی خوب ہے"۔ جبیر نے کہا وہ زیادہ تند خو اور فرعون بے سامان تھا: "ہماری ایک بات بھی بڑے ماموں جان کو اچھی نہ لگی۔ ہمیں دھمکی دی گئی اور یہ ہماری بہن جو گھر میں کام کاج کرنے والے چھوکرے کے ساتھ لگی رہتی ہے تو کسی کو برا نہیں لگتا۔ اب دیکھو کون کہے گا یہ ہماری بہن ہے۔ سب لوگ نوکرانی ہی کہیں گے۔!"

مٹی جھاڑ کر ایاز بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ناسمجھ لڑکا ہی تھا۔ ملازم کا لفظ اسے ناگوار گزرا۔ اس نے جواب دیا: "میں ملازم نہیں ہوں۔ میں بھی بڑے صاحب کا بیٹا ہوں"۔

تبیر نے بھی منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا: "بڑے صاحب کا بیٹا۔ ہا۔ ہا۔ ذرا ان کی صورت تو دیکھو۔ چہرا چندھا منہ۔ معمولی کپڑے۔ مٹی بھرے

ہاتھ۔ واہ بھئی۔ بھی بڑے صاحب کے بیٹے نے مالی پن لیا ہے۔ اے تم ہو کون۔ یہاں کیسے آئے۔ چلو۔ اپنا راستہ ناپو۔ سمجھے۔ میں یہت برا ہوں ایک ہاتھ رکھ دوں گا تو چپاتی ہو جاؤ گے!"

بھائی یہ تو دیکھو کہ یہ ہماری برابری کر رہا ہے" جبیر نے کہا۔ "مطلب یہ کہ یہ اگر نانا کا نواسہ ہے تو ہمارا بھائی ہوا۔ ایسے دو ٹکے کے لونڈے کو کیا ہم اپنا بھائی کہہ سکتے ہیں۔ ہماری بھی ناک نہ کٹے گی۔ اسے سزا دینی چاہیئے کہ یہ بڑے سرکار کا بیٹا ہونا بھول جائے!"

"دوستو مجھے بھی اپنے ساتھ سمجھو!" ایک طرف سے ارقم کی شرارت سے بھرا آواز آئی "تمھیں نہیں معلوم۔ یہ بن ماں باپ کا بچہ ہے۔ گھورے پر سے میری نانی اٹھا لائی تھیں۔ آج اسے اتنی روٹیاں لگی ہیں کہ نمک حرام ہماری برابری کرتا ہے۔ میرے اترے ہوئے کپڑے پہن کر اسکول جاتا ہے۔ اور صنوبیہ کو بھی اپنی طرف کر لیا ہے۔ کبھی دیکھ لو۔ یہ ہمارے ساتھ کیرم، شطرنج، ٹیبل ٹینس نہیں کھیلتی۔ اس نوکر بچے کے ساتھ زیادہ کام کرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ اسے اتنا مزہ چکھاؤ کہ پھر سارے مزے ہی بھول جائے!"

اچھا تو پھر ریڈی!" جبیر نے آستین چڑھا کر کہا۔ صنوبیہ یکبارگی اس کے سامنے آگئی اور ایاز کی ڈھال بن کر ارقم سے بولی "تم بہت برے ہو۔ ارقم تم جلتے ہو۔ ماسٹر صاحب نے تمھارے پنجیاں لگائی تھیں۔ ایاز کو شاباشی دی تھی۔ تم اس کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔!"

دیکھا؟" ارقم نے رشک و رقابت اور غصے کے مارے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دونوں سے کہا "میں کیا جھوٹ کہہ رہا تھا!۔

اب تو سالے کو اور مارو۔!" شبیر نے یہ کہتے کہتے ایک تھپڑ ایاز کے رسید کر دیا۔ جبیر نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔" پٹاخہ زور سے نہیں چھوٹا بھائی۔!

بھیا!" صنوبیہ چیخی۔

اسے بڑا رحم آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس غلام کی رشتہ دار ہے۔"

ارقم بولا۔ بس ان الفاظ نے جیسے ان چھوٹے شیطانوں کے آگ لگا دی ایاز پر دفعتہً پل پڑے اور اسے رگید کر رکھ دیا۔ ارقم ہنس رہا تھا صنوبیہ چلا رہی تھی۔ مگر ایاز خاموش پٹ رہا تھا۔ اس کے لبوں سے نہ ایک کراہ نکلی نہ اس کا ہاتھ ان پر اٹھا۔ اس کے گھٹتے ہوئے گالوں پر آنسو البتہ لمبی لمبی آبی لکیریں بناتے قمیص کے کالر میں جذب ہو رہے تھے!۔

اتنے میں صنوبیہ کی چیخ پکار سن کر اندر سے جمیل، ہاجرہ اور چھوٹی بھابی بھاگ کر آئیں۔ ارقم دریچے کے پیچھے دبک گیا۔ شبیر بھی کھسک لیا۔ مگر جبیر غصے سے آگ بگولہ کھڑا رہا اور ایک جارحانہ نظر ان بڑوں پر ڈال کر بولا۔" مار ڈالوں گا نوکر کے بچے کو۔ ہماری برابری کرنے چلا ہے"

کیا ہوا۔ کیا کیا تم نے۔ یہ مار پیٹ کیوں شروع ہو گئی"۔ جمیل نے کڑک کر پوچھا۔" جبیر۔ تم نے ہاتھ کیوں اٹھایا ہے اس پر"

ماموں جان" صنوبیہ نے بلک بلک کر روتے ہوئے سارا قصہ کہا۔ اور بولی" ارقم نے کہا تھا۔ ماموں جان۔ ارقم نے ایاز کو مار کھلوائی۔ آپ اسے بھی اتنا ہی ماریئے۔ دیکھیئے۔ ایاز کے منھ سے خون نکل رہا ہے۔!"

یہ جھوٹی ہے ماموں جان" جبیر نے ڈھٹائی سے کہا" اس نے ایاز کے ساتھ مل کر ہمیں گالیاں دی تھیں"

جھوٹے، لپاٹیے۔!" صنوبیہ غصے میں پاگل ہو کر جبیر پر جھپٹ پڑی۔" میں

تمھاری طرح کمینی نہیں ہوں کہ گالیاں بکتی پھروں"

"ہٹ الگ، کم بخت" جبیر نے اسے جھٹک دیا "تیرے منھ سے بھی لہو نکال دوں گا!"

"پاجی بدمعاش رذیل۔ یہ چلن سیکھا کہاں ہے۔ غارت ہو جاؤ تم دونوں بھائی میری موت کا سامان بن رہے ہو!" ہاجرہ نے بے تحاشہ کئی طمانچے جبیر کے لگا دیے۔ وہ چیختا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔ جمیل نے حیرت سے پاگل ہو کر سوچا ان لڑکوں کی یہ معاندانہ فطرت آگے چل کر کوئی خطرناک گل کھلائے گی۔ انھوں نے ایاز کو اپنی طرف کھینچا اس کے منھ کا خون صاف کیا اور چمکار کر بولے "جاؤ۔ منھ دھولو۔ رو نہیں۔ تم نے ان لوگوں سے کیا کہا تھا!"

ایاز سسکی لے کر چپ ہو رہا۔ صنوبیہ بول پڑی "کچھ بھی نہیں۔ ماموں جان۔ میں اور ایاز مل کر پھول لگا رہے تھے۔ نہ یہ کچھ بولے تھے نہ میں بولی تھی۔ بڑے بھیا چھوٹے بھیا اور ارقم نے مل کر خواہ مخواہ انہیں مارا ہے"

"اور تم سے بھیا میں بڑی عاجز ہوں" چھوٹی بھابی نے آہ بھر کر کہا "انگوٹھی کے ڈکار نے بدبخت کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔ بھلا بے چارے غریب سے اسے دشمنی کیا ہے۔ خواہ مخواہ پاپ سمیٹتا ہے۔ اسے تو یہ بھی گوارہ نہیں کہ یہ نیفے کو کھلائے!"

"اچھا اچھا۔ جو ہوا سو ہوا" جمیل نے کہا "یہ کھٹ پٹ تو بچوں میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ کوئی سیدھے سادے ہوتے ہیں کچھ کا مزاج تیز ہوتا ہے۔ اب چلو اندر چلو۔ بارش ہونے والی ہے۔ سب کو دالان میں رہنا چاہیے"

جاتے جاتے صنوبیہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ دریچے میں کھڑے ارقم و شبیر ہنس رہے تھے۔ صنوبیہ چیخ کر بولی "ارقم۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ بہت نفرت ہے۔ میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ تم اپنے گھر چلے جاؤ۔" اور روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ ارقم کے شیطانی چہرے کی مکروہ ہنسی غائب ہو گئی۔ یک بیک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہونٹ بھنچ گئے۔ شبیر اسے حیرت سے تک رہا تھا۔ بولا۔

"کیا تمھاری شادی صنوبی سے ہونے والی ہے؟ مگر ابھی تو تم صرف دسویں میں پڑھ رہے ہو۔ کہیں تمھاری نوکری بھی نہیں لگی۔!"

"تو کیا" ارقم نے گردن اکڑا کر کہا "میرا اتنا بڑا گھر ہے۔ ڈیڈی کا بہت سا روپیہ بینک میں ہے۔ ڈیڈی نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے ایک کار دلا دیں گے۔ میرا دل پڑھنے میں نہیں لگتا۔ مگر انھوں نے شرط لگا دی ہے کہ پاس ہونے پر ہی کار خرید دیں گے ورنہ نہیں۔ اس لیے جھک مار رہا ہوں۔ باجی نے دو دو بڈھے ٹیوٹر سر پر مسلّط کر رکھے ہیں۔ ایسی سختی سے پڑھاتے ہیں کہ جی چاہتا ہے گلے دبا کر مار ڈالوں۔ یقین کرو کہ کار کے لیے پڑھ رہا ہوں۔ پھر کون اوقات خراب کرتا ہے۔ شادی ہو گی تو مزے میں گاڑی میں گھوما کریں گے!"

"ہمیں بھی بٹھاؤ گے کہ نہیں! ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے۔" شبیر نے کہا "سنا ہے کہ ہمارے باپ کے پاس تھی۔ مگر ممی نہ جانے کیوں ہمیں ان سے جھگڑا لائیں اب ہم کون سے مزے میں ہیں۔ اپنے باپ کے پاس رہتے تو اچھا تھا!"

"اب کس نے روکا ہے۔ اب چلے جاؤ!" ارقم نے مشورہ دیا۔

"کہاں چلا جاؤں۔ مجھے کوئی ان کا پتہ نشان معلوم ہے"۔ شبیر نے برا سا منھ بنا کر جواب دیا: "جو بھی یہی کہتا ہے۔ ممی ظالم ہیں۔ نہ ہمیں باپ کے پاس رہنے دیا نہ خود رکھا۔ محسن نانا کے ہاں پھنکوا دیا۔ کیا ہم باپ کے رکھتے ہوئے بھی یتیم نہیں ہیں؟"

"بالکل بالکل!"

"ایک دن میں اور جو محسن نانا کے ہاں سے بھاگ کر اپنے ڈیڈی کے پاس چلے جائیں گے!" شبیر نے کہا۔ "کچھ تمھیں ان کا پتہ معلوم ہے؟"

"نہیں یار۔ میں تو فقط دو سال سے یہاں رہتا ہوں" ارقم ہنسا۔ "پہلے کی باتیں مجھے کیا معلوم ہیں۔ مگر تم پوچھ لونا اپنی ممی ہی سے!"

"وہ نہیں بتاتیں۔ کہتی ہیں بدمعاش باپ کا نام لے گا تو گدی سے زبان کھینچ لوں گی۔ ہنہہ! ایسی ہی نفرت تھی تو پھر ان سے شادی کیوں کی تھی؟"

"مگر وہ صرف تم تینوں ہی کے لیے تو محنت کرتی ہیں۔ ایک دفعہ مجھ ہی سے گیارہ سو روپے بیمہ کروائے تھے۔ تب کوئی سی عید تھی شاید!"

"تمھارے باپ نے تمھارے ساتھ کیا کیا ہے۔ انھوں نے پھوپھی جان کو گھر سے نکال کے دوسری شادی کر لی تھی"

"جیسا سلوک ممی ہم سے کرتی ہیں۔ ویسا ہی میرے باپ سے کیا ہوگا۔ وہ انھیں گھر سے نکال کے دوسری شادی نہ کرتے تو پھر کیا کرتے۔ سچ مانو کہ مجھے ممی بالکل پسند نہیں ہیں۔ مجھے اپنے ڈیڈی پسند ہیں۔ بس بڑا ہو کر نوکر ہو لگا تو ممی کو ایک پیسہ بھی نہ دوں گا!" شبیر نے کہا ارقم چپ رہا۔ وہ اچانک کچھ سوچنے لگا تھا۔

"آؤ۔ اندر چل کے بیٹھیں۔ دیکھیں اس ملازم لونڈے کے کیا ڈلار

ہو رہے ہیں۔" شبیر نے کہا۔

" میں سوچ رہا ہوں کہ صنوبیہ کو کیا ہوا۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ اسے مجھ سے نفرت ہے۔ ابھی تک تو نہ تھی۔!"

"ہاں۔" شبیر بھی چونک کر بولا۔ "وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ تم سے ہرگز شادی نہ کرے گی!" یہ کہہ کر وہ پھر اپنی مخصوص ہنسی ہنسنے لگا۔ یہ ہنسی اچھے اچھوں کو غصہ دلا سکتی تھی!۔ چنانچہ ارقم کو بھی غصہ آگیا۔ "کیسے نہ کرے گی امی جان نے تو کہہ ہی رکھا ہے کہ اسے ہم نہ چھوڑیں گے!۔

کسی نے انھیں آواز دی تھی اور وہ اندر چلے گئے تھے!۔

اور کچھ دیر پہلے کا مہیب سناٹا اب پُرشور بارش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پختہ برآمدے پر پانی ایک آہنگ سے گر رہا تھا۔ سیمنٹ کے شیڈ پر جیسے پتھر کے ٹکڑے برس رہے تھے! کبھی کبھی بادلوں میں بجلی کڑکتی اور بادل کی خوفناک گرج زمین کی بنیادیں تک ہلا دیتی! پل بھر کے لیے بادل کی گرج میں بارش کا شور دب جاتا اور پھر وہی ہوا کے تیز جھکڑ، اور بارش۔ ایسا کے آثار تھے کہ دیر تک برسے گا۔

کھلی کھڑکی سے بوچھاڑ کمرے میں آرہی تھی۔ ہوا کے طوفانی جھکڑ بارش کو ادھر ادھر اڑائے پھر رہے تھے۔ اس کے کمرے کا فرش دور تک بھیگ گیا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی کتابوں تک پھوار آرہی تھی۔ کمرے کی محدود وسعت میں گیلی سرد ہوا بھری ہوئی تھی! کبھی بجلی بڑے خوفناک انداز میں چمکتی تو کمرہ روشن ہو جاتا اور پھر مزید اندھیرا محیط ہو جاتا! لیکن ایاز عناصر قدرت کی برہمی سے لاپرواہ بستر کے ایک گوشے میں بیٹھا نجانے کیا سوچے چلا جا رہا تھا!۔ ایک طوفان اس کے چھوٹے سے دماغ میں بھی

تباہی مچا رہا تھا! ۔ وہاں بھی غصے کی بجلیاں کوند رہی تھیں ۔ وہاں بھی انتقام کے بادل گرج رہے تھے ۔ لیکن آنکھوں سے بارش نہیں ہو رہی تھی ۔ وہ جہنم کے الاؤ کی طرح جل رہی تھیں ۔

وہ سب کو تباہ کر دینا چاہتا تھا ۔ اپنے ان دیکھے ماں باپ کو ۔ مہرن خالہ کو ۔ اپنے بدترین دشمنوں کو ۔ سب کو ۔ جنھوں نے کسی وجہ کے بغیر اس کی زندگی اس پر حرام کر رکھی تھی ۔ وہ خواب پرست اور خیال پسند تھا دنیا چاہے اسے کچھ بھی نہ دیتی ۔ وہ اپنے خوابوں سے زندگی کی ساری رعنائیاں وصول کر لیتا تھا ۔ اس کے خیال اسے ایک بہترین مستقبل کے سبزہ زار پر چہل قدمی کراتے تھے ! لیکن یہ دشمن جو اسے ناجائز ، ذلیل اور غلام جیسے القاب سے یاد کرتے تھے ۔ اس کے رگ رگ سے لہو کھینچ لیتے تھے اسے خارزار حیات میں کھینچنے پر مجبور کر دیتے تھے ۔ کیوں ؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا ۔ اگر وہ یتیم ہے پھر سے زیادہ محبت اور توجہ کا محتاج ہے ۔ پھر ایک ہیبتناک خیال اس کے دماغ میں تیز سلگتے انگارے کی طرح چبھا ۔ ظاہر ہے کہ وہ یونہی وجود میں نہیں آیا ۔ نہ آسمان سے ٹپکا ہے نہ زمین سے اگا ہے تو پھر کہاں ہیں اس کے وجود میں لانے کے ذمہ دار ۔ کہاں ہیں ؟ یہ سوال یوں اس کے سر کی وسعت میں گونجا کہ طوفانی بارش کا ہولناک شور معدوم ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ پاگل ہو کر کمرے سے نکل بھاگتا اور جانے کہاں بھاگا چلا جاتا ؟ ۔ مگر اس نے بس سسک سسک کر رو دینے پر اکتفا کر لی ! ۔

چٹخنے سے دروازہ کھلا ۔ وہ سمجھا کہ کھڑکی پلی ہوئی بلی غضنفر ہے ۔ لیکن دروازے میں پھیلی تاریکی میں صنوبیہ کا سفید لباس میں ملبوس نازک

نازک سا ہیولیٰ دیکھ کر وہ جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا اور آستین سے جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے!۔

"ایاز۔!" وہ دہلیز کے پاس کھڑی تھی۔

"جی۔!" جلدی سے اُٹھ کر اس نے کھلی آن کی۔

"اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو؟۔ صنوبیہ نے پوچھا اور اندر آکے کرسی پر ٹک گئی۔

"وہ۔ وہ۔ جو اندھیرے میں۔ زور سے بجلی چمکتی ہے نا۔ تو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ اس لیے میں نے روشنی گُل کر دی تھی"۔ اتنا شعور تو اسے تھا کہ اپنے آنسو ایک لڑکی پر ظاہر کر کے خود کو خفیف و سبک نہ کرے صنوبیہ نے جھوٹ بھانپ لیا۔

"تم تو رو رہے تھے۔ جھوٹ نہ بولو۔ اچھا ایاز دیکھو۔ اب نہ رو۔ دیکھو میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں۔

اس نے دامن میں چھپایا ہوا ہاتھ سامنے لا کے مٹھی کھول دی مٹھائی کے کا جو اور شہتوت تھے۔! وہ مسکرا رہی تھی: "میرے ماموں جان نے دیے ہیں۔ چپکے سے کھالو۔

"صنوبیہ بی بی۔ میں آپ کے گھر سے جا رہا ہوں"۔

"کیا؟"

"میں نہ پڑھوں گا نہ لکھوں گا۔ میں کہیں چلا جاؤں گا۔ آپ کے بھائی اور اہرام مجھے مارتے ہیں۔ جمن دادی جو خالہ کے پڑوس میں رہتی ہیں۔ میں ان سے پوچھ لوں گا کہ خالہ کہاں گئی ہیں۔ پھر وہیں چلا جاؤں گا۔

"نہیں ایاز۔ تم مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ تمھارے سوا میرے ساتھ کون

کھیلتا ہے۔ تم چلے جاؤ گے تو پھر میں کس کے ساتھ کھیلوں گی! تم نہیں دیکھتے کہ میرے بھائی مجھے کبھی تو مارتے ہیں ابھی دوپہر کو جیو بھیا نے میرے ہاتھ سے خربوزہ چھین کر کھا لیا تھا۔ ایا نہ۔ پھر میں کہاں بھاگوں"۔

نہیں نہیں۔ آپ کہیں نہ بھاگیے گا!۔

تو پھر تم بھی کہیں نہ جاؤ۔!

اچھا۔" وہ مسکرانے لگا" میں نہیں جاؤں گا۔

تم تجّن دادی سے میرن خالہ کا پتہ تو نہ پوچھو گے!۔

نہیں!۔ نہیں پوچھوں گا۔

اچھا تو اب یہ کھالو۔ مگر تم نے رات کا کھانا کھایا ہے کہ نہیں!۔

مجھے بھوک نہیں لگی!۔

میں غفور سے کہوں گی۔ کھانا تمہیں دے جائے۔!

آپ بہت اچھی ہیں۔ صنوبیہ بی بی۔ آپ سے ایک بات پوچھوں؟

"ہاں"

کیا آپ سچ مچ ارقم سے شادی نہ کریں گی۔ دوپہر کو آپ نے کہا تھا!۔

چھی توبہ" آٹھ سال کی ناسمجھ لڑکی نے پر نفرت انداز میں ہونٹ سکوڑ لیے"۔

میں اتنے خراب لڑکے کے ساتھ کبھی شادی نہیں کروں گی۔ تم دیکھ لینا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کو گاڑی میں لیے لیے پھریں گے!"۔

اس کے پاس گاڑی کہاں ہے!۔

وہ خرید لیں گے۔

اس کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں۔ ارقم کے پاس پیسے بھی کہاں ہیں

ہاں۔ یہ بات تو ہے۔! مگر وہ گاڑی خرید لیں تو پھر۔!"
تو کیا؟" وہ معصوم انداز میں اس کا چہرہ تکنے لگی۔
تو پھر آپ کو چمکیلی سی گاڑی میں بیٹھنا اچھا لگے گا!۔
مجھے گاڑی بھی اچھی نہیں لگتی۔ اور تم بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ مجھے چڑھاتا ہے۔ مجھے جھبڑی بلی کہتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مجھے نانا جان نے بھنگن سے مول لیا ہے۔ وہ کتنا برا ہے۔ تم یہ سب کچھ مجھے نہیں کہتے۔ تم بھی بہت اچھے ہو۔ اچھا یہ لو کھا لو۔! پانی رک گیا۔ اب غفور آئے گا بلانے کے لیے۔ کھانا بھی لگ گیا ہوگا۔"

ہاجرہ نے اپنی ضد اور خود سری کا خمیازہ جو نوجوانی کے دور میں بھگتا تھا۔ وہ انھیں اتنا زیادہ ہولناک اور شدید نہیں محسوس ہوا تھا کیونکہ ان کے دکھ کے بٹانے والے بہت سے تھے۔ ماں باپ اور بھائیوں نے ان کا ہر غم ہلکا کر دیا۔ اور وہ صرف اپنے بچوں کے لیے وقف ہو گئی تھیں انھیں معقول ملازمت ملی تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکوں کے مصارف پورے کرنے کے باوجود اپنی لڑکی کے لیے بھی کافی ساز و سامان جوڑ رکھا تھا۔ اس لعنتی دور میں لڑکی کے ماں باپ ہونا گناہ ہے۔ لڑکی بے شک ایک بوجھ بن کر پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اپنے ساتھ ایک لاکھ کی دستاویز لانا بھول جاتی ہے۔ اس کی یہ بھول بڑی پر عقوبت ہوتی ہے۔ سزا ماں باپ کو جھیلنی پڑتی ہے اور خود وہ بھی اس مقصد کے تختہ پر وان چڑھتی ہے کہ کبھی

اس کا سسر اس کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالے۔ کبھی ساس نندیں اس
پر تیل چھڑک کر زندہ جلا دیں۔ کتنی پرکشش سزائیں ہیں۔ معصوم بیگناہ
لڑکیوں کے لیے۔ کتنا سرسبز مستقبل ان بے چاریوں کا منتظر ہوتا ہے۔ وہ
خدا کی پیدا کردہ دنیا میں نہیں آتیں۔ وہ اپنی بدقسمتی بھگتنے کے لیے خود بخود
پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کی پیدائش کے سلسلے میں ماں کوئی دکھ درد یا تکلیف
نہیں اٹھاتی۔ اگر اٹھاتی بھی ہے تو گناہ بے لذت۔ جب اسے پتہ چلتا
ہے کہ پورے نو ماہ کی مصیبت اور خاص گھڑی کی اذیت کے بعد اس کے
ہاں لڑکی نے جنم لیا ہے تو اسے یہ ساری تکلیفیں، مشقت اور ریاضت
محض بے کار لگتی ہے۔ جس کا کوئی پھل نہیں۔ کیا تقدیر ہوتی ہے لڑکی کی
بھی پیدائش باعث نفرت و استکراہ۔ اس کے بعد اس کا حق بھی بہت
کم ہوتا ہے۔ وہ کم مدت تک دودھ سے سیراب ہو سکتی ہے۔ کچھ بڑی ہوتی ہو
اسے دوسرے بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔ اس
کا حصہ شرع نے بھی کم رکھا ہے۔ وہ بہت سی رعائتوں اور خدمتوں سے
محروم ہے۔ اس پر گراں ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں۔ جبکہ وہ حکومت
ریاست، فرمانروائی کی اچھی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ اور پھر جب وہ سن بلوغ
کو پہونچتی ہے تو ماں باپ کے سینوں کا بار کم اور ادھر ادھر کے لوگوں کے
سر پر رکھا ہوا بوجھ زیادہ بن جاتی ہے۔ اسے جلدی کے مارے کہیں
چلتو تک دینے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ اگر سسرال اچھی ملے تو اس کی بڑی
خوش نصیبی ہے۔ اچھی نہ ملے تو ماں باپ کا کوئی قصور نہیں۔ یہ صرف خمیازہ
اٹھانے والی کی تقدیر کی خرابی ہے۔ زندہ جلے یا ناکردہ گناہ سولی پا جائے
سب جائز۔

معاشرے کی تمام خرابیاں ہاجرہ کے سامنے عیاں تھیں۔ لہٰذا انھوں نے امکان بھر کوشش کی تھی کہ لڑکی کو ہر طرح سجا سنوار دیں۔ صورتاً اصل کی ہزاروں میں ایک تھی۔ بہرحال وہ چمکا رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ساتھ ہی جہیز اور رسم ماتگی ٹکٹ کے کلی پھندے بھی اسے لگا دیں وہ ان کی طرح دکھ نہ سہے۔ خوش رہے! لیکن ان کی بھی تقدیر عجیب ستم ظریف تھی ان کے لڑکے ان کے قابو سے باہر نکلے۔ لڑکی میں خاموش ضد تھی سنتی سب کی تھی مگر کرتی وہی جو اس کا دل چاہتا!۔

شبیر جوں جوں بڑھتا گیا۔ خودسر، زبان دراز اور کم ظرف ثابت ہوا۔ جہیر اس سے دو ہاتھ آگے تھا۔ وہ اپنی در بدری کو ماں کا قصور ٹھہراتا تھا۔ ان میں جیسے جیسے دلیری آتی گئی وہ سب کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئے! اب وہ نا سمجھ بچے نہ رہے تھے کسی بھی خواہ بزرگ سرپرست کی عدم موجودگی میں وہ من مانی کرنے لگے۔ ہاجرہ کے ماموں اور ممانی نے بطور ایک بوڑھے کے انھیں اپنے پاس رکھا تھا۔ ان کا کھانا پینا، رہنا سہنا سب الگ تھا۔ اب تو شبیر اپنے نانا سے خرچ کا حساب لینے لگا تھا۔ دونوں لڑکے تعلیم سے الرجک تھے۔ بار بار محسن صاحب سید صاحب کے نام خط لکھتے ایکی گھر سے واپسی پر وہ زیادہ شوخ چشم اور منھ پھٹ ہو گئے تھے!۔

سید صاحب کا کنبہ شریف تھا۔ وہ لوگ خاموشی سے کسی جھگڑے سے فساد اور آپس کی دشمنی کے بڑی بے غبار زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ جب فیاض اور ان کی والدہ اور بہنوں نے ہاجرہ پر ظلم کا پہاڑ ڈھایا تھا تب بھی سید صاحب اور ان کے تینوں جوان بیٹوں نے کسی احتجاج اور جائز فریاد کے بغیر اپنی لڑکی کو مع داماد کی اولاد کے قبول کر لیا تھا!

تھا چوکی یا عدالت کا نام بھی نہ لیا تھا۔ اب وہ لوگ حیران تھے۔ ہاجرہ کو دق میں مبتلا ہونے اور بیٹوں کی نازل کی ہوئی زبردستی کی موت سے کیونکر بچائیں!۔"

وقت کے مضبوط ان دیکھے ہاتھ لمحوں کے پہیئے کو مسلسل کھینچے جا رہے تھے ایک ایک پل ایک ایک دن میں ڈھل رہا تھا اور دن رات کا چکر ہفتوں مہینوں اور برسوں میں تبدیل ہو رہا تھا!۔

زمانے کی عادت عجیب ہے۔ کبھی کوئی بڑا انقلاب یکبارگی نمودار ہوتا اور خاندانوں کا تختہ پلٹ دیتا ہے۔ کبھی کوئی انقلاب بہت آہستہ آہستہ کسی کی طرف بڑھتا ہے اور پھر ایک زہریلے سانپ کی طرح اچانک حملہ کر دیتا ہے۔ جیسے کسی مضبوط دیوار کی جڑ میں قطرہ قطرہ پانی پہنچا کرے اور بالآخر دیوار کو ڈھا دے!۔ ایک انقلاب گربہ قدم سید صاحب کے خاندان کی طرف بھی بڑھا آرہا تھا!۔ جس کی بے آواز گونج بھی ان کا دل ہلا رہی تھی اور وہ یہ انقلاب بڑے عرصہ سے دیکھتے آرہے تھے جس سے بچنے یا جس کے مداوے کا کوئی موثر ہتھیار ان کے پاس نہ تھا ان برسوں میں سید صاحب زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ گھر کا چارج عدیل کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اور ان کی بیگم ان سے علیحدہ ہو کر اپنے باپ کے گھر چلی گئی تھی! چھوٹے بھیا نے میڈیسن کر لیا اور ہاؤس جاب کر رہے تھے۔ جمیل کے ہاں تین لڑکے اور ہو چکے تھے؟ صنوبیہ اب سترہ اٹھارہ سال کی دوشیزہ تھی۔!۔ اس طویل عرصہ میں جو کم و بیش دس سال پر محیط تھا۔ اسے خاصہ شعور آگیا تھا وہ اپنی پوزیشن جانتی تھی۔ ماں کی کسمپرسی اور ان کے آنے والے بڑھاپے سے خائف۔ بھائیوں کی بدکرداری

بے راہ روی سے دل گرفتہ۔ ارقم کی بڑھتی ہوئی جسارت سے پریشان
اور اپنے اپنے اجنبی محسوسات سے گھبرائی ہوئی وہ ایک ایسی نوزیدہ
کلی بن چکی تھی جسے چاروں طرف سے اٹھنے والی بادِ مخالف کھل کر پھول
نہ بننے دیتی ہو۔ جس پر بادِ سموم کا اثر ہو رہا ہو جو جھلس رہی ہو۔ وہ
جتنی شوخ اور خوش مزاج تھی اتنی ہی گم صم خاموش اور اداس بن
کر رہ گئی تھی!۔

ارقم گریجویشن کر کے اپنے گھر چلا گیا تھا۔! اور اپنی ماں پر زور
دے رہا تھا کہ وہ اب صنوبیہ کے لیے پیغام دینے میں مزید تاخیر نہ کریں
پچھلی یادیں جو زیادہ خوشگوار نہ تھیں اس کے ذہن سے محو نہ ہوئی تھیں
وہ دل ہی دل میں خائف رہتا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں پھوپھی جان یا
صنوبیہ انکار کر دے!۔

شبیر نے عرصہ ہوا میٹرک میں ناکام ہو کر معمولی سی ورکشاپ کھول
لی تھی۔ وہاں وہ تین چار غنڈوں کے ساتھ بیٹھا پان چبایا اور
سگریٹ کا دھواں اڑایا کرتا تھا۔ جبیر اپنی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ
گھومنے ڈلہوزی گیا تھا وہ ادھر ہی کا ہو رہا کسی نے یہ خبر سنائی تھی
کہ جبیر نے سارہ سے شادی کر لی اور اسی کے گھر رہ پڑا تھا۔! بہر حال
ہاجرہ کی تقدیر انھیں اس عمر میں اس حال کو پہونچنے کے بعد بھی چین
سے بیٹھنے نہ دیا۔ ان کی صحت گر چکی تھی۔ انھوں نے ڈھائی سال
قبل ہی پنشن لے لی تھی۔ مکمل طور سے بڑھاپا ان پر چھا رہا تھا!۔
وہ صنوبیہ کے لیے فکر مند رہتی تھیں۔ ایسا نہ ہو کہ قسمت لڑکوں کے
ساتھ ساتھ لڑکی کو بھی شکار کر لے!۔

صنوبیہ نے انٹرنس کے بعد تعلیم ختم کر دی تھی۔ اب وہ بوڑھے نانا نانی اور ماں کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔

بہت دنوں تک ایاز کا وجود خاندانوں میں چہ می گوئیوں اور سرگوشیوں کا باعث بنا رہا تھا۔ ارتم کی والدہ کا خیال تھا کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے۔ یا ملازم کی حیثیت دی جائے۔ اسے گھر کا ایک رکن سمجھنا غلطی تھی۔ کتنی دفعہ وہ سید صاحب کی بیگم سے کہہ چکی تھیں "آپ لوگوں کو کسی خیر خواہ کی بات یا اسی کا مشورہ بد طینتی معلوم ہوتی ہے مگر دیکھنے والے تو دیکھتے ہیں کہ ایک گمنام لڑکے کو آپ نے کسی وجہ سے خاندان کا آدمی بنا رکھا ہے۔ ارے کل تک وہ ناسمجھ بچہ تھا۔ مگر آج بائیس تئیس سال کا نوجوان مرد ہے۔ نامراد کو بیٹھی جگہ کی روٹیاں ایسی لگی ہیں کہ نگوڑا سانڈ بن گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں کاٹھی سب ایسی کہ جیسے کسی شریف کے ہاں پیدا ہوا ہو۔ میں کہتی ہوں بھابی وہ مرد ہے۔ گھر سے نکلے گا تو کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے گا۔ آپ لوگ اس سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ بھیا اب ہم نے تم کو ہاتھ منہ کا کر دیا ہے۔ جاؤ اپنی روٹی آپ کھاؤ۔ اس طرح کسی کا در پکڑے بیٹھے رہنا اچھا نہیں ہے۔"

بیگم کے دل میں لوکا سا اٹھ گیا۔ انھوں نے ان دس برسوں میں خوب اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ لوگوں کی فطرت اور طینت کیا چیز ہوتی ہے ان کے اپنے کیسے نکل گئے تھے اور یہ پرایا خون جو گمنام اور بے نام تھا ان کے حق میں خون کے ناطوں سے بڑھ کر اپنا ثابت ہوا تھا۔ ایک دفعہ سید صاحب بہت شدید بیمار پڑے تھے۔ تب ان کے اپنے لوگ

کو اتنی فرصت نہ ملی تھی کہ نانا کی خدمت کرتے۔ انھوں نے تو خیریت بھی نہ پوچھی تھی۔ تب بیگم سید کتنی اکیلی اور وحشت زدہ ہوگئی تھیں ان دنوں صرف ایاز ہی ایسا نکلا تھا۔ جس نے ہر طرح ان کی خدمت کی تھی۔ بھاگ بھاگ کر ڈاکٹروں کو لاتا تھا۔ دوائیں بندھواتا تھا۔ رات رات بھر ان کے پاس جاگتا تھا۔ اور جب سید صاحب نے صحت مند ہونے کے بعد اس کی ان خدمتوں کا تذکرہ کیا تب جبیر نے کہا تھا۔

"اولاد اپنا فرض سمجھ کر تیمارداری کرتی ہے اور دوسرے لوگ غرض کے لیے۔ ہمیں جب کسی سے کوئی غرض نہیں ہے تو ہمیں خدمت کی کیا پڑی ہے!"

یہ تلخ و دل شکن جواب جو تیر کی طرح بیگم سید کے دل میں چبھ گیا تھا اس کی کھٹک اور تکلیف جوں کی توں برقرار تھی۔ جل کر انھوں نے سمدھن کو جواب دیا تھا۔

"آسیہ بہنا۔ سچ پوچھیے تو اب ہم اسی غیر کو اپنا سمجھنے لگے ہیں۔ انسان کی اولاد ہے۔ لوگ کتے بلی پالتے ہیں۔ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ بھلا کون ہے جو ہمیں ایاز کو اپنا کہنے اور سمجھنے سے روکے؟ کیا ہم کسی کو جوابدہ ہیں۔ کیا کسی نے ان کی پرورش میں ہمارا ساتھ بٹایا ہے۔ یا کسی میں اتنی ہمت ہے جو اسے اس گھر سے نکال سکے۔ نہ تو شاید یوں ہی تیرے میرے طعن تشنیع سن کر چلا جاتا۔ اسے تو شکیل کے ابا نے اپنی جان کی قسم دے کر روکا ہے۔ ہماری اولاد بے شک اپنے ہاتھ منھ کی ہو کر کمانے کھانے لگی ہے۔ ہمارے دکھ سکھ کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔ گھر کا نفسی نفسی

کا رنگ ہے وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ پیغمبروں پر بھی وقت پڑا تھا ہم پر بھی آیا تھا۔ تب نہ عدیل نے پوچھا نہ شکیل کے پاس کچھ تھا۔ جمیل کی نئی نئی نوکری لگی تھی۔ یہی بے چارہ بال باندھا غلام تھا جو ٹیوشن کر کے اپنا خرچ چلاتا ہے فیس دیتا ہے۔ کتابیں خریدتا ہے۔ کپڑے بناتا ہے اور کھانا پینا بھی الگ ہی ہے۔ مدتوں سے اس نے ہمارے گھر کا پانی تک نہیں پیا اسی نے اس آڑے گاڑھے وقت میں ہماری مدد کی تھی۔ بہن احسان ایک تمکے کی کنکری کا ہو تب بھی یاد رکھنا چاہیئے میں پوچھتی ہوں۔ اس کی ذات سے کسی کو نقصان کیا ہے۔ ہمارے گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا ہے۔ کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ آخر کیوں ایک ایک کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے؟"

ارقم کی والدہ آسیہ بیگم نے منہ کی کھائی تھی۔ کھسیائی ہوئی بلی کی طرح کھمبا یوں نوچا کہ ڈھکے چھپے انداز میں صنوبیہ پر تہمت رکھنے لگیں۔

دراصل ارقم بھڑکاتا تھا۔ اسے ایاز سے اتنی سخت دشمنی تھی کہ بعض وقت وہ سوچتا کہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنی راہ سے ہٹا دے۔ ایاز نے اپنے زورِ بازو ترقی کی تھی۔ اس نے محنت کی تھی مشقت سے اسے عار نہ تھا۔ کسی کو بتائے بغیر اس نے مزدوروں میں مل کر عمارتوں کے لیے اینٹیں ڈھوئی تھیں چونا گارا ملایا تھا۔ اسٹیشنوں پر قلی گیری کی تھی۔ اور جب وہ میٹرک ہو گیا تو اس نے چھوٹی جماعت کے طالب علموں کے ٹیوشن شروع کر دیے۔ اسے اتنے ٹیوشن مل گئے کہ خود اس کی تعلیم کے لیے وقت کا نکلنا مشکل مسئلہ ہو گیا تھا۔ اس نے سارا دن اپنے طالب علموں کے لیے وقف کر دیا اور خود نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر اس کی سوتی ہوئی تقدیر بیدار ہو گئی

اگر تقدیر کی خوبی یہی کہلاتی ہو کہ آدمی کی مٹھی گرم ہو جائے وہ ایک ایک پائی سید صاحب کے قدموں پر رکھ دیتا۔

میاں تم خرچ کر لیا کرو۔ مجھے کیوں دے ڈالتے ہو بیٹا۔" سید صاحب کو شرمندگی ہوتی۔ وہ زبان خلق کی تیر اندازی سے اس کی شخصیت کو مجروح ہونے سے بچا نہ سکتے تھے۔ اور اس کا ذمہ دار خواہ مخواہ خود کو سمجھتے تھے۔

"بڑے صاحب یہ بہت حقیر چیز ہے۔ آپ کی عنایتوں کا بدل تو میری جان بھی نہیں ہو سکتی۔ آپ میری حقیر خدمتوں کا تذکرہ کر کے مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔" ایاز جواب دیتا۔ سید صاحب نے بارہا کہا تھا کہ وہ انھیں بڑے صاحب نہ کہا کرے لیکن ایاز نے اپنی روش نہیں بدلی وہ اب سمجھدار تھا اور یہ سمجھ اور شعور اس کے لیے نہایت درجہ کی افسردگی، بے چینی اور خلش لے آئی تھی!۔

بچپن اور لڑکپن کا دور ہوا کی مانند گزر گیا تھا۔ یہ زمانہ جو اسے بہت کچھ مادی سہولتیں دے رہا تھا۔ اس کا روحانی سکون چھین کر لے گیا تھا! بیک وقت کئی قسم کی فکریں اس پر یلغار کر دیتیں۔ اور ہر طرح کی کھوکھلی دلچسپیوں سے اس کا دل اُچاٹ ہو جاتا!۔ وہ فلسفیانہ طرز فکر رکھتا تھا۔ زندگی نے اسے جس طرح ایک شرمناک دھوکے میں رکھ کر دوسروں کی نظروں میں سبک و خفیف کیا تھا۔ اس کا احساس اسے بہت تھا لیکن ان محسوسات کو ذہن سے دور ڈھکیلنے کی کوئی طاقت اس میں نہ تھی!۔

کوئی سی چھٹی تھی! وہ اپنے کمرے میں بیٹھا باغ کی سبز خلا میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ یہاں کی ایک ایک پتی ایک ایک کلی اس کی محنتوں کی

آئینہ دار تھی ۔۔! ایک اُجڑے ہوئے باغ کو اس نے ان طویل برسوں میں ہرا بھرا چمن بنا دیا تھا!۔

دفعتہً اس نے اپنے کمرے کے پیچھے افتادہ کوٹھری میں کچھ آوازیں سنیں۔ اور اٹھ کر دیوار کی طرف چلا گیا!۔ اور بند کھڑکی سے کان لگا دیے ان آوازوں کو اس نے فوراً پہچان لیا ایک ارقم کی تھی۔ دوسری گھر کی نئی ملازمہ صنوبر کی بجانے ارقم اس سے کیا منوانا چاہتا تھا۔ صنوبر کہہ رہی تھی "مگر آپ کا کیا۔ آپ تو کوئی بہانہ بنا کر الگ ہو جائیں گے۔ میں سب کو کیا منھ دکھاؤں گی۔ صاحب جی۔ میرا باپ بڑا جلاد ہے۔ وہ مجھے زندہ گاڑ دے گا! نہیں نہیں۔ پرائے پھٹے میں میں ٹانگ نہ گھسیڑوں گی!"

اچھا سن!۔ تو تو صنوبیہ بی بی کے کام کاج پر مامور ہے کبھی الطفول نے میرا تذکرہ بھی تجھ سے کیا۔ وہ مجھ سے نہیں بولتی کترا تی پھرتی ہے نجانے خود کو سمجھتی کیا ہے۔ صنوبر۔ سنو۔ یہ دفعہ اچھا ہے۔ میں تمھیں پورے ایک ہزار روپیے دوں گا۔ تم پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ بس تم میری بات مان لو!"

"اپنی عزت گنواؤں آپ کے لیے؟"

"ہشت! عزت وزت کوئی چیز نہیں۔ اگر کسی کے پاس پیسہ ہے تو عزت اسے خود بخود مل جاتی ہے۔ سمجھی میری بات۔۔!"

آپ جانئے۔۔!

ارے اور کیا۔ تم نے پوری بات سمجھ لی نا۔ اس طرح کیا ہوگا معلوم ہے۔ وہ کم بخت جو میری راہ کا ہمالیہ ہے۔ راہ سے ہٹے گا اور پھر صنوبیہ بھی میری ہو جائے گی۔ مطلب یہ کہ ایک تیر میں دو شکار!!۔۔! وہ ہنسا

آپ ان بے چارے سے جلتے کیوں ہیں؟" صنوبر بولی۔
"اگر پاؤں کی جوتی ٹوپی کی برابری کرنے لگے تو اسے سمجھانا پڑتا ہے کہ تو پیروں میں رہنے کی چیز ہے۔ نہ مانے تو پھر اٹھا کر پٹخنا پڑتا ہے۔!"
ارتم کی آواز سنائی دی۔
دو لمحوں کی خاموشی کے بعد صنوبر نے کہا "اگر کوئی آفت آئی تو۔!"
"نہ تمھارے سر نہ میرے سر۔ صاف تم اسی کا نام لے لینا۔!"
"کس کا نام؟" زیرلب ایاز بڑبڑایا۔ کیا یہ ناپاک سازش جس میں کسی طرح صنوبیہ ملوث دکھائی دے رہی ہے۔ اسی کے لیے کی جا رہی ہے؟ یا یہ اسی کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔؟
صنوبر کی تبسم آمیز آواز سے وہ چونکا! "اچھا تو پھر لائیے ایک سہارا۔!
اس کے بعد پوری خاموشی چھا گئی۔ ایاز دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ساری بات چیت ابھی اور اسی وقت جا کر سید صاحب کو سنا دی جائے پھر کچھ سوچ کر وہ رک گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ارتم کی کوئی نئی ہلوس ہو۔ اور اس میں نہ وہ ملوث ہو نہ صنوبیہ تو پھر سید صاحب کیا سوچیں گے!۔ وہ گومگو کے عالم میں پھر کرسی پر آبیٹھا۔
پانچ چھ سال سے وہ باغ میں بنی کوٹھری میں رہنے لگا تھا کبھی کبھار سید صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا! وہ تو یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانے پر مصر تھا لیکن سید صاحب نے اسے اپنی قسم دے رکھی تھی۔ انھیں احساس تھا کہ ان کی خدمت اگر کوئی کر سکتا ہے تو ایاز ہی ہے۔ سب کو انھوں نے خوب اچھی طرح کسوٹی پر پرکھ لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی سوچ کے بحرِ عمیق میں یوں گم ہوا کہ ارقم و صنوبر کی بات چیت کو بالکل بھول گیا۔

گھر میں ہونے والی چپقلش سے وہ تھوڑا بہت واقف تھا۔ ارقم کی والدہ صنوبیہ کا رشتہ لائی تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ جب ان کی بیٹی سید صاحب کے بیٹے سے بیاہی ہے تو ان کی نواسی ان کے بیٹے سے بیاہی جائے۔ سید صاحب نے صاف جواب دے دیا تھا۔

صنوبیہ کا اختیار اس کی ماں اور ماموؤں کو ہے۔ محترمہ۔! وہ دوسرے خاندان کی بچی ہے۔ ابھی فیاض میاں کا حق اس پر باقی ہے وہ اگر کبھی آنکلیں اور اپنے بچوں سے ملنا چاہیں یا ان کی فلاح بہبود کے لیے کچھ سوچیں تو ہم انھیں باز نہیں رکھ سکتے۔ یہ خون کا ناطہ وہ ناطہ ہے جسے ایک بار استوار کرنے کے بعد خدا بھی نہیں توڑ سکتا! آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔ میں فیاض کے سامنے شرمندہ ہونا یا جواب دہ ہونا نہیں چاہتا!"

"وہ نگوڑے ہیں کہاں؟" آسیہ بیگم جھلائیں۔ "پچیس برس گزر گئے نہ خیر خبر لی نہ دی۔ مر کھپ گئے کہ کہیں چلے گئے اب بھی پر ان کا حق کیا رہ گیا ہے؟"

"نہ مرے کھپے ہیں۔ نہ کہیں دفعان ہوئے ہیں۔" بیگم نے جل کر کہا۔ "تو نے کھائے اسی شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ اکثر شکیل جمیل کو ان کے بھائی بند اور کبھی وہ خود بھی دکھائی دیتے ہیں۔! ایسے جلاد جلدی مرتے نہیں۔ مجھے تو مرے نگلوں کی طرف سے دغدغہ لگا ہی رہتا ہے۔ آجائیں کبھی ملنے ملانے تو پھر۔ اے ہاں۔ اب ہاتھ پکڑ کر نکالا تو نہیں جاسکتا!"

"تو بھلا تمھاری بھی باتیں آپا زینب!" آسیہ بیگم نے دوسرا مہرہ سرکایا۔
"ان کی بچی اگر ہمارے ہاں آ بھی گئی تو ان کی شکایت کا کیا موقعہ ہے؟
بھلے ہی گھر گئی ہے نا۔ کوئی چوڑھے چمار کا خاندان نہیں ہے۔ نہ لڑکا ہی
اوباش آوارہ ہے۔ فیاض میاں کو تو بیٹی کے اچھے خاندان میں بیاہ
جانے سے اُلٹی خوش ہو گی۔ میں تو کہتی ہوں۔ یہ سب آپ اور بھیّا کی
ٹالنے کی باتیں ہیں۔ نہ فیاض میاں ابھی تک اولاد کی خیر خبر لینے آئے
اور نہ کبھی آئیں گے۔ کسی وجہ سے آپ لوگ ارقم سے لڑکی بیاہنا نہیں
چاہتے تو صاف صاف کہہ دیجئے۔ یوں مجھے معلّق نہ رکھیئے؟"
"آسیہ بہن تم ہاجرہ ہی سے بات کر دیکھو۔!" بیگم نے کہا۔ "اگر وہ
راضی ہیں تو پھر ہماری مرضی یا رائے کیا؟ لڑکی ان کی۔ لڑکا ان کی
بھاوج کا بھائی۔ وہ پسند کرتی ہیں تو پھر سب ٹھیک ہے!۔"
آپ لوگ نانا نانی ہیں۔ بزرگ!" آسیہ بیگم بولیں۔
"بزرگوں کو چھوٹوں نے اٹھا کر پرانے طاقوں پر دھر دیا ہے!" بیگم
نے جواب دیا۔ "جب تک بے غیرتی سے زندہ ہیں۔ بس زندہ ہیں!" اب
بزرگی تعظیم کے قابل نہیں رہی۔ بیزاری کا باعث ہے!"
"زینب!!" سیٹھ صاحب نے ناخوشگوار انداز میں بات کاٹ دی۔
"اس طرح کی لایعنی گفتگو مت کرو۔ بس تمھارا یہ مشورہ بہت مناسب
ہے کہ یہ محترمہ صرف لڑکی کی ماں اور ماموؤں سے بات چیت کریں!"
لیکن ماں اور ماموؤں سے گفتگو کی نوبت ہی نہیں آ سکی۔ کچھ سن گن
صنوبیہ کو مل گئی تھی۔ اس نے ہاجرہ سے کہا۔
"آپ ان گورکھ دھندوں میں مت پڑیئے۔ یونہی صحت تباہ ہو چکی ہے۔

مزید پریشانیوں کا بوجھ دماغ پر مت لادیے۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ میں آئندہ سروس کر دوں گی۔ مجھے شادی بیاہ کی فضولیات میں پڑنا نہیں ہے۔ میرے باپ اور بھائیوں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں۔ آپ نے زندگی بھر کسی خوشی کا منھ نہ دیکھا۔ اب میں آپ کو خوشیاں دوں گی۔ ممی۔ کسی کے بہکانے، سبز باغ دکھانے یا مستقبل کے خوف دلانے سے متاثر مت ہوئیے۔ ورنہ آپ کو زیادہ صدمہ پہونچے گا!"

"کیوں پہونچے گا!" ہاجرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میرے قطعی انکار سے!" دوٹوک انداز میں صنوبیہ نے جواب دیا

"تم میری خوشیاں چاہتی ہو بیٹی!"

"یقیناً"

"اگر میری خوشی اسی میں ہو کہ تم اپنے گھر بار سے لگ جاؤ۔!"

"ممی آپ مجھے کبھی بہت چاہتی ہیں نا!"

"جی رہی ہوں صرف تمھاری صورت دیکھ کر بیٹیا!"

"تو پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیے کہ آپ کی خوشی میری بربادی میں پنہاں ہے۔ ممی! پھر میں لب سی لوں گی۔ جو آپ کا جی چاہے کیجیے!"

ہاجرہ بیگم نے مٹھی بند کر کے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

صنوبیہ ہنسی! "آپ ڈرتی ہیں ممی۔ سب سے ڈرتی ہیں آپ۔ بھائیوں سے۔ بھاوجوں سے، بیٹیوں سے، ایرے غیرے دل سے۔ ابھی تو آپ کی یہ نوبت پہونچی ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ کرنے دیجیے۔

بیٹی تم عورت ذات ہو۔ تمھاری یہ عمر شادی بیاہ کی ہے۔ اب کیا میں مرتے وقت یہ داغ بھی اٹھاؤں گی کہ میں نے بیٹی کی کمائی کھائی ہے!" قریب تھا کہ وہ رو پڑتیں۔

اگر ایسی کوئی بات سامنے آئی تو ممی میں آپ کو لے کر کسی اور شہر میں چلی جاؤں گی ——— لیکن میں وہ بات ہرگز نہ کروں گی جس پر آسیہ چچی اڑی ہوئی ہیں مجھے اس گھر میں جانا گوارہ نہیں ہے!' صنوبیہ نے کہہ دیا۔

" اور اگر اللہ کوئی دوسری صورت نکال دے" نہایت پر امید ہو کر انھوں نے پوچھا۔

دوسری صورت۔!' صنوبیہ کی آنکھوں میں ایک پسندیدہ اور حسین صورت آگئی۔ جو اس کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ پھر زہریلی ہنسی ہنس دی" دوسری صورت کبھی نہ نکلے گی ممی۔ آپ یہ امید مت رکھیئے!

کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو بی بی۔

وہی سب کچھ ممی۔ جو ابھی کہہ چکی ہوں؟"

ارقم کو بھی پتہ چلا۔ وہ غصے کے مارے آگ ہو گیا۔

میں سب سمجھتا ہوں۔ صنوبیہ کو اس سے انکار کیوں ہے۔ کس نے اسے بہکایا ہے؟ مگر اس سے کہہ دیجئے۔ یہ رشتہ بچپن سے طے ہو ہو کر رہے گا!"

وہ چیخ چلا کر بات خراب نہ کرو" شازیہ نے کہا" میں صنوبیہ کو سمجھادوں گی۔ اسے انکار کیوں ہے"

مجھے سب خبر ہے۔" صنوبیہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ ماں کی طرح جھکے گی یا شکست نہ مانے گی۔ سرد لہجے میں بولی۔" لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ میں بزرگوں کے الٹے سیدھے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دوں۔ میری اپنی زندگی میرے اختیار میں ہے۔ جیسی چاہوں گزاروں!"

میں سمجھتا ہوں" غصے کی زیادتی میں ارقم بھی کہہ سکا!۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ خدا نے آپ کو اتنی سمجھ دی ہے!"

ارقم! خاموش رہو!" شازیہ نے ڈانٹا۔

باجی۔ جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے وہ میرا آخری فیصلہ ہے" ارقم نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا! اتنا کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا چل دیا۔

صنوبیہ!" شازیہ نے پیار سے اسے مخاطب کیا۔

نہیں بھابی" صنوبیہ نے کہا" مجھے کچھ مت سمجھائیے۔ میں بچپن ہی سے ارقم بھائی کا ناقابل برداشت مزاج برداشت کرتی آئی ہوں۔ اب یہ نہ ہو سکے گا! آپ بھی انھیں سمجھا دیجئے! یہ غصہ گرمی اور حکومت مجھ پر نہ چلے گی!۔

ارے وہ پاگل ہے" شازیہ نے کہا" آپ اسے سمجھ آ جائے گی۔ در اصل بات یہ ہے کہ ہم نے بچپن سے اس کے دماغ میں یہ خیال بٹھا دیا تھا کہ تم اس کی دلہن بنو گی۔ تمھارے ان خیالات کا کسے خیال تھا۔ وہ تمھارے انکار اور ضد سے بوکھلا اٹھا ہے۔۔!"

"تو آپ اپنے ناسمجھ بھائی کو انسانی شکل کا کھلونا دے کر بہلانا چاہتی ہیں۔ صنوبیہ بولی اور وہ بھی بھنائی ہوئی سی اٹھ کر چلی گئی۔!

دن کے دو بجے تھے۔ یونیورسٹی خالی ہو چکی تھی۔ تھوڑے بہت لڑکے اور اساتذہ بھی اپنی سواریوں کے انتظار میں لانچ میں کھڑے گپ شپ کر رہے تھے۔ ان میں ایاز اور اس کا دوست شکیب بھی تھا۔ سب سے الگ کھڑے وہ چپکے چپکے کچھ باتیں کر کے ہنس رہے تھے! ایاز کہہ رہا تھا۔

"تعلیم کے دوران میں سر پر سہرا لپیٹ لینا اور ایک عدد خاتون کے نام نہاد شوہر کہلانا کسی صورت سے معقولیت نہیں کہلایا جا سکتا! اب تو خیر مارے باندھے تم ہاتھ لگ بھی جاتے ہو۔ تب تو شاید تم سے ملنے کے لیے تم تک پہونچنے کے لیے ویزا اور پاسپورٹ کی ضرورت ہو گی! یہ تمھیں اتنی جلدی سوجھی کیا!؟"

مجھے نہیں سوجھی۔" شکیب نے کہا؛ "بادا جان کو سوجھی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کی دُلاری بھاوج کا رجسٹرڈ لیٹر ادھر سے آ گیا ہے۔ لہٰذا ان کی صاحبزادی سلمہا کا ارجنٹ سہرا انھیں دکھانا بے حد ضروری ہے۔ سو یہ قربانی کا جانور ہاتھ لگ گیا ہے۔ مطلب یہ کہ کسی قسم کے نوٹس یا الٹی میٹم کے بس بارہ گھنٹے کی اطلاعی آرڈر پر شادی۔ لاحول ولا قوۃ۔ وہی بات ہو۔ سیر کی خوب چٹنے پھول بہت شاد ہے۔ اور۔ شہیدوں کا جنازہ ہو ذرا دھوم سے اٹھے۔!"

کیا سچ مچ ایم کام مکمل نہیں کرو گے؟" ایاز نے اس کا دردناک شعر

نظر انداز کرکے پوچھا۔

اماں سنا نہیں کہ چچا صاحب نے لمبی چوڑی کرائے کی دوکان میرے نام ٹرانسفر کردی ہے۔ تملک ہے!" شکیب نے کہا۔ "مطلب یہ کہ جتنا دل چاہے غلّہ گھر میں بھر لو کچھ پرواہ نہیں۔ تمھیں کبھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم کرنا ہو تو سیدھے شکیب اینڈ سنز کرانہ مرچنٹ کی دوکان پر چلے آنا۔ مقفول کٹوتی پر گیہوں چاول۔"

اچھا تو حضور اب بنئے بنیں گے!" ایاز بولا۔ "سرمایہ داری کریں گے۔ ذخیرہ اندوزی فرمائیں گے۔ میں پوچھ رہا ہوں ایم کام کرنے کے بعد شریفانہ طور پر بنک کی سرکاری ملازمت تمھیں کہاں کاٹ رہی تھی جو یہ گھڑاک پھیلا بیٹھے ہو۔ واقعی۔ تم نہ رہو گے تو یہ ماحول مجھے ڈسنے کو نہ آئے گا؟ کم از کم یہ ایک سال آخری امتحان کا تو کسی نہ کسی طرح کھینچ ہی لو!"

کیا مطلب۔ تم نہ رہو گے؟ میاں۔ رہوں گا کیوں نہیں؟" شکیب نے برا مانا۔ "ایسی بھری پری جوانی میں مجھے یہاں سے چلتا نہ کردو۔ اور یہ جو تم بک رہے ہو کہ سرکاری نوکری۔؟۔ تو اس کا یہ ہے کہ مہینے بھر کی گھس گھس کے بعد گنی بوٹی نپا شوربہ لیے گھر چلے جارہے ہیں۔ میاں۔ اب تو یہ ہوگا کہ آرام سے گدیلے پر بیٹھ کر ایک دن میں سارے مہینے کی تنخواہ ایں جاب آسانی سے بنالیں گے۔ سمجھے سہ

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ رکاب کیا چیز ہے۔ آج تک میں سمجھ نہ سکا۔ اگر وزن سے گرنے کا ڈر نہ ہوتا تو علامہ اقبال رکابی کہنے جارہے تھے!"

علامہ اقبال کے سگے!" ایاز ہنسنے لگا۔ "تم سے کس نے کہا ہے کہ بیہودہ تکے الٹے سیدھے شعر سناؤ!۔ مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ شکیب۔ ایبنڈ سنز۔ تو کہاں ہیں سنز؟۔ بکواس کرتے ہو؟"

"بکواس تم کرتے ہو۔ کالی زبان تم نکالتے ہو" شکیب نے برا سامنہ بنایا "میں ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتا ہوں۔ آج نہیں تو کل۔ جب اللہ رکھے تمھارا بڑا پوتا چار آنے کا گڑ لینے آئے گا تو میرا بڑا پوتہ۔!"

"مذاق مت کرو۔ مجھے واقعی افسوس ہوگا۔ ! تم یہ سال پورا کر نہیں تو"

"ابے تم نے بھنگ پی لی ہے کیا" شکیب بگڑ گیا۔ "بار بار آپ نصیحت فرما رہے ہیں۔ ہنھ! اس زبردستی کے نکاح کے معنے یہ تھوڑی ہے کہ میں تعلیم ختم کر بیٹھوں۔ تمھارا ساتھ پھر ملے گا کہاں۔ یہ سمجھو کہ صبح دس بجے نکاح ہوگا اور ساڑھے دس بجے مابدولت پھر یہیں قدم رنجہ فرمائیں گے مطلب یہ کہ سہ

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

کسی حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ ایسے بے تکے شعر گفتگو میں ضرور پڑھو"

ایاز نے ہنستے ہوئے کہا "لو۔ تمھارے چھوٹے بھائی صاحب اسکوٹر لے آئے اچھا تو پھر خدا حافظ۔ مگر سنو۔ اپنے نکاح میں مجھے نہ بلاؤ گے کیا؟"

"گلے گلے پانی لیاں بھائی۔ ایک خطرناک سودے بازی کے وقت کسی مضبوط گواہ کا رہنا بے حد ضروری ہے۔!" شکیب نے کہا۔

ایاز پھر ہنسنے لگا "گلے گلے پانی نہیں۔ بسر و چشم بولتے ہیں۔!"

شکیب اس کا کالج کا ساتھی تھا۔ بے حد زندہ دل، دلچسپ اور مخلص

آدمی تھا۔ اکثر اسی نے بڑی فراخدلی سے اس کی مدد کی تھی اور اس کے لیے اچھے خاندانوں میں ٹیوشن تلاش کیے تھے! ایاز کو اس کی دوستی اور خلوص پر پورا بھروسہ تھا!۔ اس کے گھر بھی اس کا آنا جانا تھا۔ اور گھر والوں سے بھی ایاز کو خلوص ہی ملا تھا۔ وہ دونوں آپس میں دوست بھی تھے اور رازدار بھی۔!

شکیب نے الوداعی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

اب تو جانے ہی میکدے سے میر۔ تو سلامت رہی دباز آئی!"

میں بھی اب جا رہا ہوں۔" ایاز نے شعر کو نظر انداز کر کے کہا "پھر ملوں گا تو کچھ ذاتی باتیں کروں گا۔ تمھارے سوا بھلا کس سے کہہ سکتا ہوں!۔"

مولوی ارقم صاحب کے ملفوظات ہیں شاید

اب بھی ان کو شکایت نہیں ہے۔ اپنی الجھن ہے!"

بیان کر و فریادی۔ جہاں پناہ گوش بر آواز ہیں!۔

"تمھارے مسخرے پن سے بڑی کوفت ہوتی ہے شکیب۔ کبھی کبھی تو میں اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ تم میری پریشانیوں کو واقعی سنجیدگی سے محسوس بھی کرتے ہو کہ نہیں۔ یونہی اس کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہو۔!" ایاز بڑی دکھی آواز میں بولا۔

حالانکہ تمھارا درد دل میں ہی سنتا ہوں" شکیب نے سنجیدگی سے جواب دیا "وہ مرزا غالب کا شعر بھی ہے نا کہ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ —

لیے پیدا کیا ہے"

چلیے بھیا!" اس کے بھائی نے بڑھ کر کہا۔ اور ایاز سے بولا "شام کو آپ گھر آئیے گا! آپا نے کہلوا دیا ہے کہ کھیر اور شیر مال پر نیاز ہے۔ آپ کو

بلایا ہے۔!

"آپا کو بھی ایرے غیروں کو سمیٹنے کی بری عادت ہے۔" شکیب نے کنکھیوں سے ایاز کو دیکھ کر کہا۔ "اب ایسا نہ ہو کہ کہیں کسی کو کھیر کی کھرچن نگلا دیں۔!"

تدبیرے۔!" ایاز نے دانت پیسے۔ "میں نہیں نگلوں گا کھرچن۔ پتہ نہیں کیسے کنجوسوں سے سابقہ پڑا ہے۔ آپا بے چاری مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ دیکھا نہیں جا رہا تم سے؟"

دفعتہً شکیب کا چھوٹا بھائی عمر اچھل پڑا۔ "صنوبیہ آپا آ رہی ہیں مسز جوشی کے ساتھ۔!"

اکنومکس کے نوٹس لینے ہوں گے۔!" ایاز نے کہا۔ شکیب مسکرایا اور ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر بولا۔ "بس یار یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ تم یکبارگی گرگٹ کی طرح رنگ بدل کے سفید سے سرخ سے نیلے کیسے ہو جاتے ہو؟ اچھا اب میں چلا۔ خدا حافظ۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے۔

اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر طلعت کے ساتھ چلا گیا!۔

راہداری سے گزرتے ہوئے صنوبیہ نے ایک سرسری نگاہ ایاز پر ڈالی اور ان کے ساتھ آگے بڑھ گئی؟ ایاز سن سا کھڑا رہا۔ کیوں آئی تھی وہ یہاں۔ اس کا یہاں کیا کام تھا؟ کیا اس نے ملنے کا بہانہ نکالا تھا۔؟ ایک مدت گزر چکی تھی دونوں میں بات چیت نہ ہوئی تھی۔ صنوبیہ نیز نظریں رکھی جاتی تھیں اور ایاز ایک پشتینی غلام کی طرح گھر سے دور باغ کے کھنڈر کمرے میں پڑا رہتا تھا!۔

وہ سوچ میں غرق بے معنی انداز میں خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ دفعتہً اس نے ایک بھرائی ہوئی سرگوشی سنی: "سنو۔ ایاز۔!"

وہ جلدی سے مڑا۔ گرد و پیش سناٹا تھا۔ غالباً چپراسی اور چوکیدار بھی کمرے بند کر کے جا چکے تھے۔ صرف سیمنار دل سے باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی!۔

یہاں آپ کا آنا کیسے ہوا؟ ایاز نے پوچھا۔ وہ بہت لیے دیے اور محتاط رہنے لگا تھا۔ حالانکہ اس طویل مدت میں اجنبیت، تکلف اور غیریت کے سارے اعتبارات ختم ہو چکے تھے۔ لیکن احساسِ شباب۔ اور کچھ نئے جذبات نے ان کے درمیان بیگانگی اور حجاب کی ایک دبیز دیوار کھڑی کر دی تھی!۔

کیا کسی کا یہاں آنا منع ہے؟" صنوبیہ یوں مسکرائی جیسے چپکے سے کوئی کلی منھ کھول دے!۔ ایاز چپ رہا۔ دل میں طوفان سے کروٹیں بدل رہے تھے آج کتنے دنوں بعد اس نے اسے دیکھا تھا۔ کتنی پیاری ہو رہی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید ریشم میں لپٹی جوہی کی کلی۔ نہائے دھوئے سیاہ دراز بال جو اس نے تھوڑے سے گوندھ کر یونہی کھلے چھوڑ دیے تھے۔ پاکیزہ چہرہ۔ آنکھوں کی کاجل کی سیاہی لبوں کے دلفریب گلابی نے اس کے سفید سفید چہرے کو عجیب سا حسن بخش دیا تھا۔ کتنی خوشنما آنکھیں تھیں جیسے مسجد کے محرابِ ابرو کے نیچے دو چراغ روشن ہوں۔!

مسز جوشی سے نوٹس لینا ہے شاید۔!" خاموشی سے گھبرا کر ایاز نے کہا۔

بالکل نہیں۔ یہ تو مجھے بازار میں شوپنگ کرتی مل گئی تھیں" صنوبیہ نے مسکرا کر سر کو ایک خوب صورت انداز میں جھٹکا یا: "انھوں نے کہا کہ ان کا ارادہ یہاں آنے کا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی لیتی چلئے واپسی پر پھر پک اپ کر لیجیے

گا۔ وہ رضامند ہو گئیں۔ مجھے نوٹس وغیرہ کچھ لینا نہیں ہے۔ فقط تم سے ملنا تھا۔!

مجھ سے کچھ کام ہے!" دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھال کر اس نے پوچھا۔

"نانا ابا نے منع نہیں کر دیا کہ تم سے کوئی کام نہ لیا جائے۔؟"

خادم تو ہوں آپ سب کا!

اب تو اتنی خاکساری اور کسر نفسی مت کیا کرو۔" صنوبیہ بولی اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا "آؤ۔ ادھر ہسٹری کے ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ میں نے ممتاز بی بی سے کہا تھا کہ مجھے تاریخ کے ڈیپارٹمنٹ سے لے لیجیے گا۔ ورنہ مجھے یہاں وہاں ڈھونڈتی پھریں گی!۔ آؤ چلیں۔!"

"مگر۔ صنوبیہ بی بی۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ کہ کہ"

"کہو۔ رک کیوں گئے؟"

آپ اور میں وہاں بیٹھ کے باتیں کریں!"

اتنی زیادہ بری بات بھی نہیں ہے۔ کیوں۔ کیا تمہاری نیت صاف نہیں ہے!۔

"نہیں نہیں۔ خدانخواستہ۔!"

باتیں تو بزدلوں کی سی کرتے ہو!۔

اچھا چلیے۔ مگر میں کینٹین میں کہہ آؤں کہ آپ کے لیے پیسٹری اور کافی بھجوا دی جائے۔ لیکن آپ کیا یہاں دیر تک ٹھہریں گی۔ یہ چھوٹا سا ناشتہ دان آپ کے ہاتھ میں کیسا ہے؟"

تم کافی اور پیسٹری کے لیے کہہ آؤ تو بتاؤں گی!۔

اچھی بات ہے۔ میں ابھی آیا۔ آپ تب تک جا کے بیٹھئے!"

پانچ منٹ بعد جب دونوں پر سکون تنہائی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے تب ایاز گھبرا رہا تھا اور صنوبیہ کے عارضوں پر رہ رہ کر سرخی بکھر جاتی تھی۔ اس نے اپنی کسی کیفیت پر قابو پانے کے لیے ہنستے ہوئے توشہ دان ایاز کے سامنے رکھ دیا۔

"کل دوپہر گاجر کا حلوہ بنا تھا۔ منوں گھی، کھیرہ اور خشک پھل ممی نے اس میں جھونکے ہیں۔ اتنا لذیذ ہو گیا ہے کہ جی چاہتا ہے کھاتے چلے جائیں۔ میں نے تو خوب سا کھایا ہے۔ اماں نے کہا تھا کہ ایاز کو حلوہ نہیں ملا۔ لہذا آپ کے لیے میں دو ڈبے بھر کے لے آئی ہوں۔ اب ختم کرو انہیں جلدی سے۔ پھر بیرہ مطلوبہ چیزیں لے آئے گا!"

"آپ نے اپنی بچپن کی عادت ابھی تک چھوڑی نہیں ہے" ایاز ہنسنے لگا! "ہمیشہ آپ نے اپنے حصے سے میرا حصہ نکالا ہے۔ سچ مچ اتنا خیال آپ میرا کرتی ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں بے نوا اور بے بضاعت آپ کے اتنے گرانقدر احسانوں کا بدلہ کیسے اتار سکوں گا!"

کیا سچ مچ یہی سوچتے بھی ہو جو کہہ رہے ہو؟" اس نے حیرت سے کہا" ایاز کیا کسی کے خلوص اور گہرے محسوسات کا کوئی بدلہ یا معاوضہ بھی ہو سکتا ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتاؤ کہ کیا ہے کیونکہ میرا خیال ابھی تک یہی تھا کہ بعض چیز دل کا کوئی معاوضہ کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں!"

"ہاں۔ ہمیشہ غلطی میری ہی نکلتی ہے۔ نجانے اتنی نا سمجھ کیوں ہوں۔!"

صنوبیہ بی بی۔ آپ۔!

"تم سے میں نے کتنی بار کہا ہے ایاز۔ مجھے صنوبیہ بی بی کہہ کے اتنی تعظیم اور احترام سے مت مخاطب کیا کرو۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے تم تو اتنے ہی دس گیارہ برس

کے بچے ہو مگر میں یکبارگی پچاس سال کی ہوگئی ہوں۔!"

"یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے" ایاز پھر ہنس دیا "آپ نے نہیں سنا۔ ایاز قدر خویش را بشناس" اس کی ہنسی تیز ہوگئی "معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات میرے لیے ہی کہی گئی ہے۔ واہ۔ تقدیر نے اس زبان سے کیسی سچی پیشین گوئی نکلوائی اسم بامسمّٰی بن کر رہ گیا ہوں!"

"دیکھو اب اگر تم نے اچھی اچھی باتیں نہ کیں تو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی" صنوبیہ نے بگڑ کر کہا "میں بہانہ بنا کر تم سے ملنے اس لیے نہیں آئی کہ تمھاری جلی جلی کٹی سنوں۔

معاف کیجیے؟" وہ شرمندہ سا ہوگیا "ہاں تو آپ شروع کیجیے۔ اچھی اچھی باتیں۔ میں صرف سنوں گا! میں تو کچھ بھی نہیں کہوں گا کیونکہ میرے پاس اچھی بات ایک بھی نہیں ہے!"

بیرہ ایک ٹرے لیے ہوئے آگیا! دونوں چپ ہوگئے! اس کے جانے کے بعد ایاز نے کہا "اب یہ بچا ہوا حلوہ میں گھر لے جاؤں گا۔ زندگی میں پہلی بار کھایا ہے۔ کتنا مزیدار ہے۔ آپ نے تو اس میں سے چکھا بھی نہیں!

یہ تمھارا حصہ تھا! کافی بناؤں!

لائیے۔ میں بناتا ہوں!

نہیں!

اچھا تو آپ ہی بنائیے!" اس نے کیتلی کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا لیا۔ صنوبیہ یک لخت بپھر گئی۔

"اتنی جلدی سپر انداز کیوں ہو جاتے ہو۔ نہ احتجاج نہ اصرار۔ چھین جھپٹ کر اپنا حق منوانا تمھیں کیوں نہیں آتا؟ تمھاری کمزوری کی خاموشی اور صبر کے انداز نے

یہ دن دکھایا ہے کہ کونے میں پڑے ہوئے ہو، عضو معطل کی طرح۔" اس نے کافی پیالی اور چار پیسٹریاں اس کی طرف سرکا دیں۔" خبردار کیے دیتی ہوں ـ یہ سب تمھیں کھانی پڑیں گی۔ مجھے پتہ ہے کہ صبح تم نے ناشتہ نہیں کیا تھا!"

ایاز کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔"اب یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کسی کی زیادتی پر احتجاج کیوں نہیں کرتا؟ صنوبیہ بی بی۔ مجھے حق حاصل نہیں ہے کہ میں چھین جھپٹ کر کسی سے کچھ حاصل کروں۔ کیا میرا ماضی آپ پر عیاں نہیں ہے؟۔

ماضی؟" برا سا منھ بنا کر صنوبیہ نے بات کاٹ دی۔" اکثر لوگوں کے ماضی قابل اعتراض ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی فرشتہ پیدا نہیں ہوتا کیا ان کے ماضی کو کرید کر حشرات الارض برآمد کرنا ہے پھر تم اپنے ماضی کو کیوں نہیں بھول جاتے۔ اس طرح تو تمھاری ساری جبلتیں مردہ ہو جائیں گی۔!"

"تو پھر کیا ہو جائے گا؟"

تم ہنس رہے ہو ایاز؟۔

جی ہاں۔! آپ کی معصومیت پر۔!

کیوں میں نے کوئی ایسی ہی مضحکہ خیز بات کی ہے!؟

آپ نے مجھ سے بہت سی غلط اور پوری نہ ہونے والی توقعات وابستہ کر لی ہیں!۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے ایاز۔ میں تمھیں ایک مثالی انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم پچھلی باتیں فراموش کر دو۔ انسان کو ہمیشہ آگے کی راہ پر نظر رکھنی چاہیے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تمھاری پریشانیاں، فکریں، برہمی اور غصہ تمھارا اچھا یہ برا ماضی تمھارے لیے تبدیل نہیں ہو سکتا!۔ پھر تم اپنے

حال اور مستقبل کو سنہرا بنانے کی کوشش کیوں نہ کرو۔ اتم ہمیشہ اچھی پوزیشن لاتے ہو۔ ابھی اس دن تایا ابا نے کہا تھا کہ وہ نیشنل بنک کی اسپشل اسسٹنٹ شپ سے عنقریب ریٹائر ہونے والے ہیں۔ اور ان کی جگہ تمھیں رکھا جا سکتا ہے بس یکبارگی تمھاری قسمت پلٹ جائے گی!۔ ایاز! سمجھ میری بات!"

سمجھ گیا آپ کی بات!" وہ اب بھی یوں زیرلب مسکرا رہا تھا جیسے صنوبیہ کی ناسمجھی کا لطف لے رہا ہو۔ "صنوبیہ بی بی، قسمت کیا صرف دولت ہی سے پلٹتی ہے۔ انسان کو صرف روپیہ پیسہ ہی چاہیے اور کچھ بھی نہیں!"

آج کل کی دنیا میں سکھ سے جینے کے لیے روپیہ ہی بڑی چیز ہے!" وہ اس طرح بولی جیسے اسے خود اپنی بات کی بے وزنی کا احساس ہو گیا ہو!۔ ایاز نے نفی میں سر ہلایا۔

آپ ابھی کچھ نہیں سمجھتیں! دولت سے انسان صرف مادی مسرتیں خرید سکتا ہے۔ روحانی خوشیاں روپے پیسے سے نہیں خریدی جا سکتیں۔ اگر مجھے کوئی بڑا عہدہ مل گیا مجھے دولت نصیب ہو گئی۔ مجھے خدا نے کچھ بنا دیا۔ تب بھی صنوبیہ بی بی۔ تب بھی مجھے ذہنی سکون اور روحانی خوشی نصیب نہیں ہو سکتی!"

کیوں؟۔

"کیونکہ تب بھی میں جو کچھ چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں مل سکے گا!"

تم میں ہاتھ بڑھا کر وہ چیز اٹھانے کا بوتہ بھی نہیں؟۔

نہیں صنوبیہ بی بی!۔

عجیب آدمی ہو!" صنوبیہ نے حیرت سے کہا۔ "تو پھر جی کیوں رہے ہو؟۔

یقیناً غلطی کر رہا ہوں" وہ ہنسنے لگا۔ اگر بڑے صاحب کی بات کا پاس و لحاظ نہ ہوتا اگر آپ کی توجہ کا سہارا نہ ہوتا تو پھر میں نہیں جانتا کہ میں کہاں

ہوتا۔ کیا کرتا؟ اور اب کبھی میں سوچتا ہوں کہ آپ ایک نہ ایک دن اپنے گھر چلی جائیں گی۔ بڑے صاحب کو مجبور کر کے مجھے دربدر کر دیا جائے گا تو پھر کیا ہو گا کیا کروں گا میں!"

نہیں!" صنوبیہ نے سنجیدہ انداز میں سر ہلا دیا "مجھے ہوائے گھر جانا نہیں ہے۔ ممی سے میں نے کہہ دیا ہے۔ اگر وہ کسی کے سلسلے میں مجھے مجبور کریں گی تو پھر انجام بہت برا ہو گا۔ اس طرف سے تم اطمینان رکھو... اور تمھیں کوئی دربدر کبھی نہ کرے گا کیا تم گھر کے ایک فرد نہیں ہو!"

شاید آپ کے نزدیک ہوں گھر کا ایک فرد۔ کسی اور کے لیے نہیں!"

ایاز؟ برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

ضرور پوچھیے۔ آپ کی بات کا برا ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا!"

کیوں۔؟" وہ پھر اپنے خاص انداز میں مسکرائی۔

کیونکہ آپ اتنی اچھی ہیں۔ ہمدرد ہیں۔ مہربان ہیں۔ میں اگر آپ کی بات کا برا مانوں گا تو کیا آپ برا نہ مانیں گی؟۔ تو پھر پوچھیے۔ کیا بات ہے؟"

"تم نے کبھی بیرن خالہ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ آخر تم ان کے پاس کیسے آ گئے؟۔ انھوں نے تمھیں کسی گھر سے چرا تو نہیں لیا تھا۔ اتنے دن تک پالا پوسا اور پھر کسی وجہ سے پیچھا چھڑا کر گاؤں جا کر لاپتہ ہو گئیں۔"

"صنوبیہ بی بی۔ میں بچپن میں بڑا احمق تھا" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "سچ مانیے کہ مجھے خالہ سے یہ ضروری بات پوچھنے کا مطلق دھیان ہی نہیں آیا۔ اور نہ انھوں نے کبھی تذکرہ کیا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ کسی نے اپنی پیشانی کا کلنک گھورے پر پھینک دیا تھا۔ خدا ترسی کے مارے خالہ اٹھا لائیں۔ یہ ہے میری کہانی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جس ہستی کا ماضی اس قدر تاریک اور شرمناک

ہو۔ وہ زندگی کی دوڑ میں کیونکر حصہ لے سکے۔ کیونکر کسی سے من چاہی چیز طلب کر سکے۔ کیونکر کسی پر اپنا حق مسلط کر سکے۔ نہیں ہو سکتا نا ایسا؟۔ اس لیے میں نے دنیا داد درویش کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس ہوں مگر جی رہا ہوں!"

"تمہیں جینا ہی ہے ایاز۔ تم میرے دوست ہو۔ اور تم نے ہمیشہ وعدہ کیا ہے۔ میرا ساتھ کبھی نہ چھوڑو گے، بس یہ یاد رکھنا!" صنوبیہ نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔

"آخری سانسوں تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا!" وہ اپنی آنکھوں میں چھپے محبت کے لبریز ساغر اسی پر انڈیلتا ہوا مخمور لہجے میں بولا: "مگر۔ آپ نے اپنا وعدہ یاد نہ رکھا۔ تب؟!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں جینے کا حوصلہ سکھاؤں اور خود زندہ رہنے کا طریقہ بھول جاؤں۔؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ صنوبیہ بی بی۔!"

"ایک آدھ بات کا مطلب تم خود سمجھ لیا کرو۔ مگر ایاز۔ تم مجھے اس طرح بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہو تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ تم کتنے اپنے سے لگنے لگتے ہو؟"

"اچھا؟" وہ گلابی ہو کر جھینپے انداز میں ہنسنے لگا!۔

اس خرابہ کائنات میں زندگی گزارنے کے لیے کسی نہ کسی امید اور آس

کی بیساکھیاں بہت ضروری ہیں۔ کوئی موہوم سی توقع جو پوری نہ ہو سکتی ہو۔ انسان کو تگ و دو کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ امید نہ ہو تو زندگی اسکی ایجاد در محض بن کر رہ جائے!۔ آدمی کی حیات بے ثبات کے لمحات گنے گنے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آغاز کے ساتھ ہی اپنا انجام بھی لے آتا ہے اور اس حقیقت کو سمجھتا بھی اچھی طرح ہے وہ جو کچھ کر رہا ہے۔ سب کو چھوڑ چھاڑ کے چل دیتا ہے۔ زندگی کا یہ پاگلوں کا سا گورکھ دھندہ بس چند روز بہار ہے۔ متاع قلیل مدت کے پروگرام کتنے لمبے چوڑے کتنے پائیدار اور وسیع و عریض ہوتے ہیں! جیسے اسے ابد کے کنارے چھونے ہیں۔ آج ہی ایک آدمی کو کندھوں پر لاد کر لاتا ہے اور شہر خموشاں کے سناٹوں میں گم کر کے خود چہل پہل کی دنیا میں کھو جاتا ہے اور نہیں سوچتا کہ ایک دن دوسرے لوگ اسے اپنے کندھوں پر لائیں گے اور مٹی کے ڈھیر تلے چھپا کر چل دیں گے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو خدا کی ساری مخلوق گوتم ہی گوتم بن کے ویرانے بسا لیتی اور آبادیاں ویران ہو جاتیں۔ انسان کو ایک پاگل سی عقل اور دیوانی سی سمجھ دی گئی ہے اور بس وہ خوب مزے سے جی رہا ہے!۔

ایاز ابھی تک ایک تاریک غار میں جیتا رہا تھا۔ صوفیہ کی نصیحت اور حوصلہ افزائی نے اسے اس غار سے باہر نکال لیا۔ اب اس کا دل چاہ رہا تھا۔ دنیا کی دوڑ میں اندھا دھند حصہ لینے والوں کے ساتھ خود بھی بھاگ پڑے!۔ اور اس نے اپنی تگ و دو تیز کر دی۔ یہ سوچے بغیر کہ اب جانا کہاں تھا؟

ایک خواب پرست آدمی یوں حقیقت کی سنگلاخ سے ٹکرایا کہ اس کے سارے ہی خواب بے تعبیر رہ گئے۔ اب وہ سبھی مرہون کا متلاشی تھا!۔

پہلے پہل اسے بڑی شرم لگتی تھی۔ اپنے مخالفین کے بقول وہ خود رو تھا اب اس نے اثر لینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ نا سمجھ سا تھی بھی جانے کدھر کدھر کے ہو رہے تھے مگر ایک مستحکم چٹان تھی جو اس کی راہ میں بدستور موجود تھی۔ ادم کی ہستی کی چٹان۔

گرمی کے موسم کا وسط تھا۔ دن بھر گرم ہوا چلا کرتی۔ اور باغ میں بگولے چکر لگاتے۔ درختوں پر گرد کی تہہ جم رہی تھی۔ ہر چیز پر سناٹا سا برس رہا تھا۔ امتحانات شروع ہو چکے تھے! صنوبیہ جو پرائیوٹ گریجویشن کر رہی تھی اب بے حد مصروف رہنے لگی تھی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ کوئی سند لے کر ملازمت کرے اور اپنی ماں کے دکھوں کا مداوا کر سکے!۔ ان دنوں پہاڑ سے جبیر آیا ہوا تھا۔ اور ماں بہن کے حق میں ایک نئے دکھ کا باعث بن گیا تھا!۔

رات بڑی حسین تھی۔ شفاف آسمان پر پورا چاند روشن تھا۔ پلکیں جھپکاتے ہوئے ننھے منے تارے یہاں وہاں بکھرے تھے۔ صحن میں ایک طرف موگرے کا جھنڈ تھا۔ جس پر کثرت سے پھول کھلے تھے۔ سارا صحن تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کھانے سے قبل سب صحن میں آ بیٹھے، سید صاحب ان دنوں کچھ بیمار تھے صنوبیہ انھیں پکڑ کر باہر لائی۔ وہ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ اور اپنی کسی تکلیف سے آہستہ آہستہ کراہنے لگے!۔

ابی جی کہاں تکلیف ہے؟" صنوبیہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اور ان کا کندھا دبانے لگی" آپ نے ڈاکٹر صاحب کی دوائی چھوڑ دی۔ اب ایک مرتبہ حکیم صاحب ہی کو دکھا دیجیے۔ ان کی دوا میں تو شراب یا برانڈی کی ملاوٹ نہیں ہوتی!"

یہ تو بڑھاپا ہے بیٹی۔ اور بڑھاپا کسی حکیم یا ڈاکٹر کے علاج سے نہیں جاتا" وہ ہنسنے لگے" تم فکر نہ کرو۔ یہ جوانی دور سے چل کر آیا ہوں۔ تو سانس

پھولنے لگی ہے! - پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا! -

جبیر بڑی دیر سے ایک مونڈھے پر بیٹھا موتیے کے پھول نوچ نوچ کر پنکھڑیاں زمین پر بکھیر رہا تھا - اور اس کی یہ حرکت دیکھ دیکھ کر صنوبیہ کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن وہ چپ چاپ پیچ و تاب کھاتی رہی۔ !

تم جا کے پڑھو بیٹی۔ چوبیس تاریخ سے تمھارا امتحان ہے۔ میری فکر ناحق کرتی ہو۔ سید صاحب نے کہا۔ بیگم وہیں بیٹھی عامرہ کے چھوٹے بچے کو سلا رہی تھیں۔ انھوں نے کہا: "اور تو آپ کا بھلا چاہنے والا نگوڑا ہے ہی کون - باپ مرے کے جیئے ماں جہنم جلی جائے جہنم میں۔ کسی کو کوئی فکر ہے۔ اولاد پیدا کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں کام آئے۔ ہم نے اولاد پیدا کی ہے۔ دوسری عورتوں کے لیے جوان جہان مردوے سسرال کے غلام ہو کر رہ گئے۔ عدیل نے دوسری شادی کیا کی ہے کہ گھر ہی کو بھول کے رہ گئے۔ اب وہاں ارمانوں بھری اولادیں پیدا ہوں گی۔ نگوڑی شہلا کے کرم بھی پورے ہو گئے۔ اللہ نے بچہ نہ دیا۔ تو اس کا کیا قصور۔ نہ اسے طلاق دیتے ہیں نہ گزارہ۔ بڑی جھینک رہی ہے میکے میں۔ عدیل کو پڑھائی سے فرصت نہیں کہ باپ کو پوچھ لیں۔ اجی آپ سنتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ایاز سے کہیے کہ ڈاکٹر جبین صاحب کو پھر بلا لائے۔ ان کے انجکشن سے آپ کو فائدہ ہوا تھا۔"

نفسی نفسی کا دور ہے بی بی۔" سید صاحب کچھ سوچ کر مغموم ہو گئے: کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ تم ناحق رنج کرتی ہو۔ میں نے تو فرض کر لیا کہ میں بے اولاد ہوں۔ مجھے اب رنج نہیں ہوتا۔!"

اور اولاد آپ کی اگر کوئی ہے تو وہ غلام ہے۔" دفعتہً جبیر بولا: وہ آپ کا خیر خواہ ہے۔ دکھ درد کا ساتھی ہے۔ ارے! میں تو سمجھا تھا کہ وہ کہیں منھ کالا

کر گیا ہو گا۔ بے حیا کی بلا دور۔ تعجب ہے کہ روٹی توڑنے کے لیے مسٹنڈا ابھی تک یہیں پڑا ہوا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے رہتے تک ملعون کو نکال باہر کروں گا!۔ کہاں ہے؟ باہر کے کمرے میں!؟

جیسے آئے ہو ویسے ہی دفعان بھی ہو جاؤ:۔ ہاجرہ نے کہا: "تمھیں گھر کے کسی معاملے میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے!۔

اچھا تو یہ کہیے کہ اب وہی سب کچھ ہو گیا ہے"۔ جبیر نے جواب دیا: "ہمارے گھر سے دور رہنے کا فائدہ سب سے زیادہ اسی کو پہونچا ہے۔ ممی جی یہ بات تو نہیں ہے کہ جیسے آپ نے حسب نسب جانے بغیر ایک واہیات آدمی کو اپنا شوہر بنا لیا تھا۔ اسی طرح اس غلیظ کو آپ نے اپنے داماد کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے؟؟:

تمھارے منھ میں گھی شکر!" صنوبیہ نے دل ہی دل میں کہا۔ البتہ بیگم صاحبہ اور ہاجرہ اس پر اُدھڑ پڑیں۔ بیگم نے بے نقط سنائیں۔ ہاجرہ نے ایک تھپیڑ اس کے گال پر رسید کر کے غصے کے مارے کانپتے ہوئے کہا۔

"جبیر۔ خیریت اسی میں ہے کہ چلا جا۔ ابھی اور اسی وقت دفع ہو جا میرے سامنے سے سچ ہے بری زمین کی نصل بھی بری ہوتی ہے۔ نجانے کیا سوچ کر ان سپنولوں کو ساتھ لگا لائی تھی کہ مجھے اس عمر میں ڈستے رہا کریں۔ یا تو خدا ان صورت حراموں کی نیچ عمر بنر کر لے یا پھر میرے وجود سے زمین کا بوجھ ہلکا کرے"

"سچی بات پر برا مانا لیا ممی۔ مجھے وجہ بتائیے کہ آپ نے ابھی تک اس حرامی کو کیوں پناہ دے رکھی ہے"۔ جبیر ہار ہی ماننے والا کب تھا" پہلے تو یہ جواز تھا کہ وہ بے سہارا بچہ تھا۔ حالانکہ یہ جواز بھی معقول نہ تھا کیونکہ دس گیارہ سال کے بچے بھی کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر ہی لیتے ہیں... مگر اب تو وہ پچیس سال کے

لگ بھگ ہو رہا ہے۔ اب ایسے آپ لوگ گھر سے کیوں نہیں نکال دیتے!"

"ایک بات بتاؤ گے!" سید صاحب نے باوجود مشتعل ہونے کے سرد لہجے میں بولے اور کپکپا دینے والی ٹھنڈی نظروں سے جبیر کو دیکھنے لگے!۔

"جی۔!" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

"تمھیں اس سے دشمنی کیوں ہے؟" بتاؤ مجھے!"

"نانا ابا۔ ہم بدنام ہو رہے ہیں اس کی وجہ سے!" جبیر نے کہا "میرے دوست اکثر کہتے ہیں کہ بھئی غلاظت کا انبار گھر میں کیوں لگا رکھا ہے؟"

"تمھارے دوست؟" سید صاحب تمسخرانہ انداز میں ہنس کر بولے "مطلب یہ کہ گندگی اور غلاظت کے منفرد انبار۔ جنھوں نے اپنا تعفن اس طرح تم پر انڈیلا ہے کہ تم بھی غلاظت ہی کا ایک ڈھیر بن کر رہ گئے ہو۔ تمھیں بزرگوں کا ادب نہیں رہا ہے۔ تمھیں ماں سے محبت نہیں ہے۔ تم کو بہن کی فکر نہیں ہے تم نے تعلیم بھی پوری نہیں کی۔ تمھاری ماں اپنے کندھے توڑ محنت کی مزدوری تم کو بھجواتی رہی اور تم عیش کرتے رہے۔ تم ایک دو غلی نسل کی کرسچین اچھو کری کے شوہر بن گئے۔ اپنی اوقات برباد کرتے رہے۔ تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم خود کیا ہو۔ تمھیں کسی کو برا کہنے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ تم خود انتہا سے زیادہ برے ہو!"

"نانا ابا یہ حضرت ایاز کی حمایت میں ہے؟" جبیر نے پوچھا۔

"ہاں!۔ تم یاد رکھو کہ اسے میں نے رکھا ہے۔ تم نے نہیں!" سید صاحب کا ضبط رخصت ہو گیا۔ اب وہ گرج رہے تھے "جب تک میں زندہ ہوں، وہ میرے پاس رہے گا۔ کیونکہ مجھے بھی کوئی ایسا ہمدرد چاہیے جو دم آخر میرے منھ میں پانی چوا سکے! میرے مرنے کے بعد ایک ناگوار بوجھ کی طرح

مجھے کھنڈ میں تو پ نہ آئے۔ بلکہ مجھ پر دو سچے آنسو بھی گرا سکے۔!"

"اے نوج۔ چپ رہیے"۔ بیگم نے تنک کر کہا "بات کا پہاڑ بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔ یہ کل کے بچے جو اپنے سامنے ننگے کھلے پھرا کرتے تھے۔ ان کی باتوں کا بھی کوئی معیار ہے۔ یوں چیخ چلا کر اپنی طبیعت مت خراب کیجیے"۔

"اب ہم بچے نہیں رہے نانی اماں"۔ جبیر جارحانہ انداز میں بولا۔

"بزرگوں سے بات کرنے کا سلیقہ سیکھو"۔ عمرانہ نے غصے سے کہا۔ "اور اب تم بہت بک بک کر چکے جاؤ یہاں سے۔ مار کے آدھا منڈوہ غارت کر کے رکھ دیا۔ ایسے شوق سے صنوبہ ہار گوندھتی ہے۔!" امی۔ منو سو گیا ہو تو دے دیجئے ادھر لٹا دوں۔ آپ کا زانو سُن ہو جائے گا"۔

"رہنے دو۔ بی"۔ امی نے مسکرا کر کہا "جب تک کوئی بچہ میری گودی میں نہ رہے مجھے چین نہیں آتا!"

کچھ دیر جبیر خاموش بیٹھا گھٹنا ہلاتا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ برآمدے میں صنوبیہ کھڑی چاندنی کا نظارہ کر رہی تھی۔ آہٹ سن کر اس کے لب مسکرا گئے!

"یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟" جبیر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"آپ کی آنکھیں تو کمزور نہیں معلوم ہوتیں۔؟!" صنوبیہ بولی۔

دفعتہ جبیر کی نگاہیں باغ کی آخری حد تک پھیل گئیں۔ ٹوٹے ہوئے حوض کی منڈیر پر ایاز بیٹھا تھا۔ اس کی پشت تھی برآمدے کی جانب۔ مگر جبیر کے دل میں شعلہ سا اٹھ گیا۔ زہر خند کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"البتہ آنکھیں تمہاری ہر طرح تیز معلوم ہوتی ہیں چاندنی میں مطالعہ فرما رہی ہیں! صنوبیہ! میں جانتا ہوں کہ وہ حرامی بچہ تمہیں اپنے پھندے میں الجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جب تک میرے اور بھیا کے دم میں دم ہے یہ اندھیر نہیں ہو سکتا! بھیا نے بھی کہا تھا کہ بس ابھی یہاں سے جی کر

ہے۔ اسے نکال ہی کے دم لیں گے! یہ کیا تماشہ ہے۔ وہ سامنے مرا ہوا ہے اور تم یہاں کھڑی ہو۔"

صنوبیہ میں بھی وہی خون تھا جو جبیر کی رگوں میں تھا۔ وہ بہت خفارت سے بولی "تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جس طرح تم لوگوں نے ماں کو دکھ دے کر اس کے کلیجے میں ناسور ڈال کر بھنگن اور چماریوں کو پسند کر لیا ہے اسی طرح میں بھی کوئی ناپاک کھیل کھیلوں گی مگر نہیں۔ جب ممی نے کہا تھا کہ شیر اور جبیر مر چکے ہیں۔ ممی نے ان کا چالیسواں کر دیا ہے تو میں نے سوچا کہ ممی کی رہی سہی دکھ بھری زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار کرنے کے لیے اب مجھی کو لڑکا بننا پڑے گا۔ سر جبیر بھیا۔ تم جاؤ کسی چمارن کے ساتھ جوتے سیو۔ اگر ان کی آنکھیں چمگادڑ کی سی ہیں۔ یا میں ان کا تماشہ دیکھ رہی ہوں تو تمھاری بلا سے۔ آئندہ مجھ سے اس طرح ذلیل انداز میں گفتگو نہ کرنا۔ تم میرے بھائی نہیں ہو تو پھر مجھ سے بھی اپنے لیے لحاظ کی امید مت رکھنا!"

"جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے" جبیر کا لہجہ۔ جیسے زبان سے زہر ٹپک رہا تھا۔ اس کا تدارک بہت ضروری ہے۔ خیر۔ بھیا اور راز تم بھائی کو آنے دو!"

"تمھیں شرم آنی چاہیئے" صنوبیہ نے بھی شعلہ بار لہجے میں جواب دیا "اپنی چھوٹی بہن اور ایک غیر مرد کی نسبت تمھارے خیالات اتنے گندے ہیں اگر کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو تم اس کا خون پی جاتے نہ کہ تم خود اپنے منہ سے گندگی بکھیر رہے ہو۔ بس تمھیں اپنا بھائی کہتے شرم محسوس کرتی ہوں تم کان کھول کر سن لو۔ پچاس بھیا اور ہنگرز اور تم مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جو کچھ تم ناپاک تثلیث کرنا چاہتے ہو کر گزرو۔!"

"اچھا اچھا" جبیر خوابیدہ آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ بس نہ چلتا

تھا کہ اس گستاخ زبان ذرا سی لڑکی کی بوٹیاں اڑا دیتا!۔

"بیٹا آپ کی کافی اور میکرونی!" دفعتہً وہاں صنوبر آگئی!۔ اس کے ہاتھوں پر چھوٹی سی چمکدار ٹرے تھی جس میں میکرون کی طشتری اور کافی سے لبریز پیالی تھی! جبیر کی نظریں اس پر پڑیں اور اس نے دانت چمکا دیے!۔ صنوبر کوئی چھ ماہ قبل اوپر کے کام کاج اور شازیہ کی بچی کے کھلانے پر نوکر رہی تھی۔ بیس اکیس سال کی خوب صحت مند گٹھیلے جسم کی سانولی رنگت کی قبول صورت لڑکی تھی۔ نہایت شوخ دیدہ، بڑی طرار اور چرب زبان تھی!۔ جتنی چالاک اتنی ہی حریص، چور اُچکی، فتنہ فساد برپا کرانے میں ماہر۔ اس نے جبیر کی قابلِ اعتراض نظریں بارہا دیکھی تھیں مگر برا نہ مانا بلکہ اٹھلا کر یوں شرمائی کہ جبیر کے نفس کی چنگاریوں کو ہوا دے دی۔!

"کون ہو تم؟" اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا بھول گیا کہ ابھی ابھی صنوبیہ کو سرزنش کر رہا تھا!

"ٹرے منڈیر پر رکھ دو۔ اور تم فوراً بھاگو یہاں سے" صنوبیہ نے لڑکی کو بری طرح جھڑک دیا۔ پھر وہ آگے بڑھ کر منڈیر پر ٹک گئی! میکرونی کا ننھا سا ٹکڑہ منھ میں رکھا اور کافی کی پیالی لبوں سے لگالی۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ جبیر ہے کہ چلا گیا۔ وہ البتہ قہرناک نظروں سے صنوبیہ کو گھور رہا تھا!۔ پھر اس نے ایک نظر باغ پر ڈالی۔ وہاں بھی ایاز نہ دکھائی دیا۔ دانت پیس کر جبیر نے زیرِ لب کہا۔

"معلوم نہیں تھا۔ گھر میں یہ تماشے ہوا کرتے ہیں۔ خیر۔ میں بھی دیکھ لوں گا!" وہ باہر نکلا اور اس کی مڈبھیڑ ارتم سے ہوگئی! رسمی سی علیک سلیک کے بعد ارتم نے مسکرا کر پوچھا: "فرمائیے جناب۔ بی سارہ کے کیا حال ہیں۔ آپ

سے کیسی نبھ رہی ہے۔ کس سلسلے میں تشریف آ رہی ہوئی حضور کی ؟"

سوالوں کی بوچھار کر دی آپ نے " جبیر مسکرایا " میرا بس ایک جواب ہے کہ اب تو آرام سے گزر رہی ہے۔ اور —

ہاں عاقبت کی فکر ہمیں کیوں ہو" ارقم بولا " آؤ ادھر بیٹھ کے باتیں کریں۔ میں بھی اب جا ہی رہا تھا!۔

ہائیں۔ تو کیا آپ اندر ہی تھے ؟۔

ہاں۔ باجی کے پاس!۔

دونوں آگے بڑھ کر ہار سنگھار کے پیڑ سے لگی سنگی بنچ پر بیٹھ گئے۔ ارقم نے سگریٹ سلگائے ایک خود لبوں میں دابا اور دوسرا جبیر کی طرف بڑھا دیا۔

" آپ کہیئے۔ آپ کی دال کچھ گلی ؟ " جبیر ہنس کر بولا۔

زبردستی گلانی پڑے گی " ارقم کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی۔ اب وہ خوفناک لگ رہا تھا " یار! تمہاری بہن۔ برا مت ماننا۔ مجھے تو کچھ بہکائی ہوئی لگتی ہے۔ اور ارقم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے درمیان شیطان کا کردار کون ادا کر رہا ہے!۔ تعجب ہے کہ تم لوگ بھی آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھے ہو۔! نہ تو تمہارے نانا کی غیرت کو جنبش ہوتی ہے نا پھوپھی جان ہی کچھ اعتراض کرتی ہیں۔ ہمارے گھر میں تو واقعی بڑی تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ امی اور ڈیڈی حیران ہیں کہ آخر ایک ناجائز، شرمناک ناپاک ہستی کو نانا جان محترم اور نانی اماں محترمہ نے سینے سے کیوں لگا رکھا ہے!۔"

سمجھ میں نہیں آتا۔ ارقم بھائی " جبیر نے دو گہرے کشوں میں سگریٹ کا مردہ نکال کر دور پھینک دیا اور بولا " ابھی میں نے ذرا مڑ کر دیکھا کہ وہ اوپر کھڑکی ہے اور پیچھے وہ ٹکٹکی لگا بیٹھا ہے۔ اشارے بازیاں ہو رہی ہیں " جبیر

"نے کئی پھند نے اپنی طرف سے جوڑ دیئے!۔"

"واقعی؟"

"دیکھ ہی کے جو آ رہا ہوں!"

"تعجب نہیں کہ زیادہ دونوں کو!۔"

"نانا ابا پھانسی پر نہیں لٹکا دیں گے۔ اب صنوبر نہ میری بہن ہے نہ میری ماں کی بیٹی وہ بس دونوں بڈھوں کی جاگیر بن کر رہ گئی ہے۔ ان ہی کے پاس وہ بدمعاش بھی گھسا رہتا ہے۔ بہت چاہتے ہیں اسے۔ پڑھوا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ نانا ابا کسی بڑے پوسٹ پر رکھا بھی دیں گے!"

"ناقابل برداشت، قطعی ناقابل برداشت" ارقم نے مٹھیاں کس لیں۔

"اس حرام زادے کا پتہ تو میں چپکے چپکے کاٹ ہی رہا ہوں۔ گہری پالیسی ہے۔ پیٹ پر پڑے گی۔ مگر اب ان بڈھوں کا بھی کوئی علاج کرنا پڑے گا!۔ کیا واقعی تایا ابا اسے کسی پوسٹ پر رکھا دیں گے!۔"

"سنا تو یہی ہے!"

"جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں" ارقم پاگل ہونے لگا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خبیث سے ان کم بخت بڈھوں کی محبت کی وجہ کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ گل تایا ابا یا نانا ابا ہی کا کھلایا ہوا ہو تبھی تو۔ ورنہ اتنی توجہ اتنا التفات اتنا خلوص ان منحوسوں نے تو مجھے دیا نہ تم لوگوں کو۔ یہ سارا پیار اس حرامی پلے ہی پر کیوں نچھاور ہو رہا ہے۔!"

"ہو سکتا ہے کہ تایا ابا یا نانا ابا ہی کا کارنامہ ہو، میری خالہ راز دار بنائی گئی ہوں" جمیر نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا "آپ نے اپنی اسکیم نہیں بتائی۔"

اتنا کودن نہیں ہوں کہ تم کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کر لوں!" ارقم نے منہ بنا کر کہا بات تو صنوبیہ ہی کی نا ارقم بھائی" جبیر نے اسے لاجواب کر دیا۔ "آپ جو اسکیم بنا رہے ہیں گے وہ اس لیے کہ ہماری بہن ایک ناپسندیدہ آدمی سے محفوظ رہے۔ آپ اگر ہمارے بہی خواہ ہیں تو پھر ہمیں سے یہ رازداری کیسی؟ آپ سمجھے؟"

"مزاج کے تم اول جول ہو میاں" ارقم نے کہا "کبھی تمھیں غصہ آ جائے اور تم میرا پلان سب کے سامنے بکھیر دو تو پھر۔ مارا جاؤں نا میں بیچ چوراہے پر!"۔

لاحول ولاقوۃ۔ اس قدر پھوٹی ہانڈی آپ نے مجھے سمجھ رکھا ہے!" جبیر نے برا مانا۔

اچھا تو کان ادھر لاؤ۔!" ارقم مسکرایا۔

جبیر بھی ہنستا ہوا اس کے بالکل پاس کھسک گیا۔ دونوں دس پندرہ منٹ تک کھسر پھسر کیا کیے پھر جبیر ایک مطمئن سانس لے کر بولا:

"ارقم بھیا۔ کام جوکھم کا ضرور ہے۔ مگر ہے زوردار، مطلب یہ کہ آپ کی ہلدی پھٹکری کچھ کم ہی لگے گی مگر رنگ گہرا آئے گا!۔ تو پھر دلوا دیجئے۔ ہزار بارہ سو پیشگی۔ اس اُلو کی پٹھی کے ہاں گڑبڑ ہونے والی ہے۔ اسی طرح میرا کام بھی نکل جائے گا اور آپ کا بھی۔۔ میں اسی لیے ممی کے پاس آیا بھی تھا۔ مگر انھیں کبھی جانے کیا سکھا دیا ہے بڑھی نے۔ ممی نے کافی کوڑھی تک سے مدد کرنے کی حامی نہ بھری!"

تمھارے ہاں بچہ ہونے والا ہے" آنکھیں پھاڑ کر ارقم نے پوچھا۔ وہ لگ بھگ اٹھائیس تیس کا ہو رہا تھا مگر بے نا تھا بیل بنا پھر رہا ہے۔ اور یہ جبیر تو شاید چوبیس کا بھی نہ تھا۔ رشک کے مارے وہ جل جل مرا۔ جبیر بے حیائی سے مسکرایا۔

"جی ہاں وہ جو بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ خدا کی دین۔!"

"یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" ارقم کی زبان پر خدا لگتی آ ہی گئی۔ "تم دونوں میں سے کسی ایک کو تو پھوپھی جان کا سہارا بننا ہی تھا۔ تبہیر نے الگ گھر بسالیا۔ تم نے یہ دھاندلی کی تعلیم تک پوری نہ کر سکے۔ بے چاری نے عمر بھر محنت کر کے تمھیں تعلیم دلوانی چاہی تھی۔ آخر ان کے دل میں بھی آرزوئیں ہوں گی تم نے پامال کر دیں۔"

ارے سب چلتا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں اچھائی برائی کی جمع جوڑ کرنے بیٹھے تو اپنے ارمانوں کا خون ہوتا ہے۔ شانوں کو جنبش دے کر لاپروائی سے وہ بولا۔ "ممی نے ہمیں بدگوشت کی طرح الگ پھینک دیا۔ وہ منحوس مارے محسن نانا اور ان کی بیوی بڑا ظلم کرتے تھے ہم پر۔ بھیا اور میں اس لیے بددل ہو گئے کہ ممی کے بھجوائے ہوئے بارہ سو بھی بدبخت بڈھا اپنی گرہ میں رکھ لیتا تھا۔ ایک دفعہ ہم دونوں نے آئسکریم کھانے کے لیے پانچ روپے مانگے تب بڈھے نے دیے۔ ممی کو الٹا لکھ دیا کہ ہم برف کھا کھا کر گلے خراب کر رہے ہیں چنانچہ یہاں سے ان بڑے میاں کی ڈانٹ وہاں پہونچی بھیا نے کہا کہ دنیا میں اپنا کوئی نہیں۔ بس چلو نکلو اس قفس سے۔ اپنی دنیا الگ بسائیں۔ یہ ہے سارا قصہ!"

"خیر مار دگولی۔ مجھے کیا۔" ارقم بولا اور اٹھنے لگا۔

آپ چلے کہاں۔؟" جبیر نے اس کا بازو پکڑ کر پھر اسے بٹھا دیا۔ "کچھ دیتے تو جائیے۔"

اماں۔ جیب اس وقت قطعی خالی ہے۔" ارقم نے کہا۔ "تم خود میری تلاشی لے لو۔ جھوٹ نہیں بول رہا۔ کل اسی وقت یہیں ملنا۔ دو سو دے سکتا ہوں۔"

سودا تو دو ہزار پر طے ہوا ہے بھائی صاحب!"
داد بھئی۔ بنیا در پڑی نہیں اور تم منزلوں کی گنتی کرنے لگے۔" ارقم نے
کہا۔"ہیں کیا کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ جب سے
والد صاحب قبلہ نے دوکان میرے سپرد کی ہے۔ پائی پائی کا حساب
لینے لگے ہیں۔ اپنی جیب کے گرم ہونے کا موقعہ ہی کم رہ گیا ہے!۔
"تو پھر۔؟
"نہیں تو بہر حال اپنی مزدوری سے مطلب۔ مطمئن رہو۔ کل ملنا
اچھا۔؟"
"ٹھیک ہے۔ بائے!"
ارقم اپنی راہ پر گیا اور درخت کے پاس کھڑا سوچ میں ڈوبا جبیر
دیر تک تنکے سے خلال کرتا رہا۔
ارقم کی تجویز مناسب تھی۔ پٹے پڑ ہی نہ سکتی تھی۔ وہ مسکرایا۔ اور پھر
کسی نے اسے اوپر سے آواز دے کر کھانے کے لیے بلا لیا۔
دالان کے بڑے تختوں پر ان دنوں دستر خوان بچھا تھا سب اکٹھا تھے
سید صاحب ایک آرام کرسی پر نیم دراز شوربے میں بھیگے پھلکے چمچہ چمچہ
کھا رہے تھے۔ ان کے پہلو میں ایاز تھا۔ بہت دنوں بعد وہاں دکھائی دیا
تھا۔ جبیر نے منہ بنا کر رخ پھیر لیا۔ سید صاحب اس سے کہہ رہے تھے کہ
انھیں اس کے ساتھ بینک جانا ہے!۔ جبیر بظاہر کھانے کی طرف متوجہ تھا
مگر اس کا سارا جسم ایک کان بنا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا!۔

ٹھیک دو پہر کو صنوبیہ پرچہ دے کر گھر آئی۔ اس کا خوبصورت معصوم چہرہ دھوپ کی حدت سے تمتما رہا تھا۔ پیشانی پر بال پسینے میں چپک گئے تھے۔ اور کالی کالی متوالی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔! دالان میں آکر اس نے تعجب سے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہ تھا۔ ملازمہ نے بتایا کہ بیگم صاحبہ اور ہاجرہ، عامرہ وغیرہ خاندان کی ایک بزرگ خاتون کی موت میں چلے گئے تھے۔ سید صاحب اپنے دیوان خانے میں آرام کر رہے تھے!۔ گھر اکیلا تھا!۔

"یہ لوگ کب واپس آئیں گے؟۔ کہہ کے نہیں گئے؟" صنوبیہ نے پوچھا عجیب سی اداسی اس کے دل و دماغ پر منڈھ گئی تھی۔

"صاحبزادی مجھ سے بھلا کیا کہتے؟" ملازمہ بولی "اب ان بیگم کے کفن دفن کے بعد ہی آئیں گے۔ شاید بعد نماز مغرب!۔ آپ کے لیے کھانا لاؤں کہ آپ پہلے نہائیں گی؟"

"کیا پکایا ہے؟" صنوبیہ نے قلم گریبان سے نکال کر میز پر ڈالا اور تھکی تھکی سی سید صاحب کی آرام کرسی پر لیٹ گئی۔

"قیمہ بھرے بڑے مرچے ہیں اور مچھلی کا سالن"

"تھوڑے سے چاولوں پر مچھلی کا سالن ڈال لاؤ۔ اب کھانے کے کمرے میں کون جائے۔!"

"اچھا اچھا! آپ تب تک منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ میں ابھی لائی!"

صنوبیہ اٹھ گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کی نئی ملازمہ صنوبر برآمدے والے کمرے سے نکل کر تیزی سے موڑ پر غائب ہو گئی تھی۔ صنوبیہ کو حیرت ہوئی۔ وہ کمرہ اکثر مردوں کے استعمال میں رہتا تھا اور وہ کمرہ تھا جس میں شروع شروع ایاز کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا! ۔صنوبیہ دو لمحوں تک گم صم کھڑی رہی۔ اسے اول روز ہی سے صنوبر پسند نہ تھی۔ اس کی شوخ چشمی اور گستاخانہ حرکتیں اسے زہر لگتی تھیں۔ لیکن چونکہ وہ اپنی خدمت کی بڑی تیز تھی۔ اس لیے اس کی تیزی طراری بھی جبراً قہراً گوارا کر لی جاتی تھی!۔

ماما اس کے لیے کھانا لے آئی!۔ اور ٹرے میز پر رکھ کر اسے گلاس میں پانی دیا۔

"سنو! راحت بی۔ یہ صنوبر ادھر کیوں آئی تھی؟ صنوبیہ نے پوچھا۔

راحت بی نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے "اے اس کا کیا صاحبزادی چھلے پیر کی بلی ہے مردار، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ہوائی چیل کی طرح سارے گھر میں حرافہ ڈولتی پھرتی ہے۔ پتہ نہیں اس کمرے میں کیوں گھس گئی۔ دیکھا میں نے بھی تھا۔ پر کچھ کہہ کے مرادجلی سے ایک کی دس کون سنے؟ میں تو چپ رہ جاتی ہوں۔ بیگم صاحبہ کی اذن ملے تو تگنی کا ناچ نچا دوں چڑیل کو۔ خود کو نجانے سمجھتی کیا ہے۔؟"

ملازمہ کے جانے کے بعد صنوبیہ نے اس کمرے میں دیکھا اور یکبارگی اسے یوں لگا جیسے اس کے سر میں زور سے چکر آگیا ہو۔ اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ہو۔ سامنے بوسیدہ سی مسہری پر کروٹ لیے ایاز سو رہا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس صنوبر کا ململ کا سا دوپٹہ پڑا تھا اور نیچے

فرش پر دس روپے کا ایک نوٹ ہوا سے ادھر ادھر پڑا ناچ رہا تھا!۔

آن واحد میں ایک شرمناک سین پر سے پردہ اٹھ گیا!۔

بڑی سختی سے صنوبیہ نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دابا اور پردہ برابر کر کے لڑکھڑاتے قدموں سے واپس کرسی کے پاس جھکی کھڑی رہی۔ اس کے دماغ میں انجن چلتے رہے۔ اور دل دھڑکتا رہا۔

تو کیا ایاز اور صنوبر —؟

نہیں۔! اس نے سر ہلایا۔ یہ ناممکن ہے۔ گھر میں لاکھ تنہائی ہو لیکن اتنی ارکاکت اتنی بے حیائی ایاز سے ناممکن ہے۔ وہ اس حد تک نہیں گر سکتا۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ دن دھاڑے۔ سیٹھ صاحب کے عین پڑوس میں۔ اور پھر صنوبر کی سی دو ٹکے کی ماما۔ مگر اس دنیا میں ناممکن کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شیطان نے یونہی انگلی دکھائی ہو۔ صنوبر کتنی دیدہ دلیر، کتنی تیز طرار۔ بناؤ سنگھار کیے رہتی ہے اور دس کا وہ نوٹ کیسا تھا؟۔ شاید کسی خدمت کی اجرت ایاز نے دی ہو۔ اور بھاگنے میں صنوبر کے ہاتھ سے گر گیا ہو۔ وہ شاید اسی کی آواز سن کر بھاگ گئی۔ اور ایاز سوتا بن گیا!۔

جس قدر زیادہ صنوبیہ سوچتی گئی اس کے ذہن پر یہ نکھرتا گیا!۔ کوئی اوئی سی تاویل بھی ایک چشم دید واقعہ کو جھٹلا نہ سکتی تھی۔ اور پھر تاویل ہوتی بھی کیوں۔ اسے کیا پڑی تھی کہ وہ ایاز کی بریت میں کوئی دلیل دیتی بس وہ تو اپنے نظریوں کی شکست و ریخت پر اندر اندر خون کے آنسو رو رہی تھی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ جسم پھنک رہا تھا اور ہاتھ پیر برف ہو رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہی دیر بعد اس کی حرکت قلب

رک جائے گی۔!

ایاز۔ جسے اس نے بے حد شریف، بلند، خاموش طبع، تعلیم یافتہ اور بڑی خوبیوں کا مالک سمجھا تھا۔

ایاز۔ جو دس گیارہ سال کا دُبلا بسورتا سہما ہوا مفلوک الحال اجڑا ہوا لڑکا تھا۔ جس کی ہمیشہ وہی بے سروسامان کی شکل صنوبیہ کی نظروں میں رہتی تھی۔ اور اسے اب بھی چوبیس سال کا نوجوان ماننے سے منکر تھی۔ وہ ایاز جسے صنوبیہ کی آبیاری نے تناور درخت بنایا تھا۔ اس نے یہ کیا کر دیا۔ اپنی ساری بلندی ارزاں ترین پستی میں بدل دی۔ پاکیزگی اور طہارت کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس کی تو یہ ٹوٹے ہوئے پیمانے سے ٹوٹی۔ اُف۔ صنوبیہ نے گھومتا ہوا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور کرسی میں گر کر پشت گاہ سے سر ٹیک دیا۔ اس کی بند آنکھوں تلے ایاز کا سویا ہوا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کے دماغ میں دس کا ایک نوٹ پھڑپھڑا رہا تھا!۔

ایک نہایت بے اطمینان سانس لے کر اس نے کہا۔ کیا ضروری تھا کہ یہ ناپاک تماشہ سب سے پہلے میں دیکھتی؟۔

وہ اپنے خیالوں کے ٹوٹ جانے پر کتنی مغموم تھی۔ جیسے کوئی عبادت گاہ شہید ہو چکی تھی۔

اب اس کا اگلا قدم کیا ہو گا؟۔

کیا وہ نانی اماں سے یہ سارا قصہ کہہ دے؟ وہ نکال دیں گی دونوں کو۔ گندگی کے انبار کو باہر پھنکوا دیں گی۔ نانا ابا کیا سوچیں گے؟ ان کے دل پر کیا صدمہ گزرے گا؟۔

ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری

کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ ابی جی نے نالی کے کیڑے کو عطر کی ڈبیہ میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔!

دن ڈھلتا رہا اور وہ گم صم پڑی اندھا دھند سوچتی رہی۔ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں! ملازمہ ایک بار پھر آئی دیکھا اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی! کھانا جیسے کا تیسا رکھا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

"یہ کیا۔ صاحبزادی آپ نے تو کھانا چھوا بھی نہیں۔ میں آپ کی چائے لے آئی ہوں، کیا خدا نہ کرے جی اچھا نہیں ہے بی بی؟"!

بمشکل تمام اس نے حلق سے آواز ابھاری "ہاں۔ مجھے چکر آ گیا تھا تم کھانا اور چائے سب لے جاؤ۔ میں کچھ نہ کھاؤں گی!"

تھوڑا سا دہی لے آؤں۔ وہ کھا لیجئے۔ گرمی کی وجہ سے آپ کو چکر آ گیا ہوگا" ملازمہ اپنی کہے گئی "غسلخانے میں تازہ پانی رکھ دوں؟ آپ نہا لیجئے!"

"راحت بی۔ خدا کے لیے تم جاؤ۔ مجھے خاموش بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے!"

اچھا صاحبزادی۔ مگر کچھ کھانے پینے کو دل چاہے تو آواز دے لیجئے گا!" راحت بی برتن سمیٹ کر چل دیں! گھڑی نے بلند آواز میں تین بجنے کا اعلان کیا! اور دفعتہً ایک دروازے سے سید صاحب باہر آئے تبھی دوسرے دروازے سے ایاز دکھائی دیا۔ صنوبیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا! بلاختیار بلا ارادہ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی!

اوہو۔ بیٹی تم کب آئیں" سید صاحب نے کہا "پرچہ کیسا گزرا سوالات مشکل تو نہیں تھے؟ کل کاہے کا پرچہ ہے!"

سب ٹھیک ہے ابی جی"! بھرائی ہوئی آواز میں وہ بولی اور ایاز

کی طرف سے چہرہ پھیر لیا۔

کھانا کھا لیا تم نے؟۔

"جی۔!" اس کے حواس ابھی تک درست نہیں ہوئے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ ایاز کی ناپاک شخصیت پر نظر بھی نہ ڈالے۔ ادھر وہ متحیرانہ نظروں سے اس کی لے رخی دیکھ رہا تھا۔ پھر سید صاحب اس سے مخاطب ہو گئے!۔

حکیم احمد حسین صاحب نے کب تشریف لانے کو کہا تھا؟۔

جی۔ تین بجے: ایاز نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی: اب شاید آتے ہوں میں نیچے جا کر بیٹھتا ہوں۔ ابھی تک ان کا انتظار کر رہا تھا پھر تھوڑا سا سو بھی گیا تھا!: وہ مسکرایا۔

جھوٹے، ڈھیٹ، پرلے درجے کے بے شرم۔ صنوبیہ بے آواز چلائی۔

میاں۔ تھوڑا سا تو ہم بھی سو گئے تھے: سید صاحب ہنسنے لگے!: خیر۔ چلو تو حرج کیا ہوا۔ وہ آئیں گے تو غفور اطلاع دے گا۔ تم تو کھانا منگواؤ۔ اب قرأت شروع ہو چکی ہے:

اچانک ایاز نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر سید صاحب کی طرف بڑھا دیا اور بولا:

"بڑے صاحب۔ یہ نوٹ کمرے میں پڑا ملا ہے۔ معلوم نہیں کس کی جیب سے گر گیا۔ آپ رکھ لیجئے! شاید اماں کا ہے:

پڑی پائی ہوئی چیز ہر حال میں اپنی: سید صاحب نے بے حد خوش دلی اور محبت سے ہنسے: میں کیوں رکھ لوں۔ نوٹ میرا تو نہیں ہے۔ اسے تم ہی رکھ لو۔ اب اماں وغیرہ سے مت کہنا۔ ان کا اگر نہ بھی ہوگا تو وہ کہہ دیں گی کہ انھیں کا ہے:

یہ نوٹ تو شاید آپ ہی کا ہے۔!" جلے بھنے شک سے لتھڑے لہجے میں صنوبیہ نے ایاز سے کہا۔ "یاد کیجئے۔ آپ نے غالباً کسی کو انعام دیا تھا۔ یاد کیجیے!"

ایاز نے حیرت سے صنوبیہ کو دیکھا اور اس کی گرم نگاہی سے جھلس کر پھر نظریں جھکالیں اور دھیمے سے بولا۔

میری حیثیت اتنی نہیں ہے کہ یہ نوٹ میں کسی کو انعام میں دے سکوں آپ شاید مذاق کر رہی ہیں۔ جس کا بھی ہو اُسے دے دیجیے!" اور نوٹ کو ریڈیو کی میز پر کتاب کے نیچے رکھ کر چلا گیا!۔

ہُنھ!۔ رنگا سیار!۔ صنوبیہ بڑبڑائی۔ یا خدا آدمی کتنی دیر بعد پہچانا جاتا ہے۔ آدمی کی شخصیت پر کتنے گہرے نقاب پڑے رہتے ہیں!۔

بیٹی کیا تم کچھ خفا ہو اس بےچارے سے۔؟" سید صاحب کہہ رہے تھے "ایسا چبھتا ہوا لہجہ تم نے اختیار کر لیا تھا کہ مجھے بھی حیرت ہوئی... معمولی سی بات ہے۔ ایک نوٹ کی اہمیت کیا۔ تمھیں بہت وسیع النظر ہونا چاہیئے اور ماشاء اللہ تم ایسی ہی ہو۔"

ابی جی کاش میں آپ سے کہہ سکتی۔ صنوبیہ نے دل میں کہا اور پھر کھانا لانے کا بہانہ کر کے ان کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اب وہ بے چینی سے اپنی نانی اور ماں کی آمد کی منتظر تھی۔

ایاز اپنے کمرے میں گیا تو بہت مضطرب تھا۔ صنوبیہ کی بے مہری اور لہجے کے طنز نے اسے بے چین کر رکھا تھا!۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کی کون سی خطا ایسی تھی جس نے صنوبیہ کی سی بے ریا، مخلص اور پر محبت ہستی کو اس سے برگشتہ کر رکھا تھا۔ وہ کرسی پر جھک گیا اور صنوبیہ کی خشمگیں نگاہوں کی چبھن کو ذہن کی سطح سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگا!۔

کھانے کے لیے بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں" غفور دروازے میں کھڑا منمنا رہا تھا۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ صاحب سے کہو کہ آپ نوش فرمائیں" وہ بددلی سے بولا۔ اور غفور کے جانے کے بعد پھر سوچ میں گم ہو گیا اسے شروع سے لے کر اب تک کی صنوبیہ کی مہربانیاں یاد آرہی تھیں۔ اس نے عمر بھر اس کی دوست رہنے کے عہد و پیمان متعدد مرتبہ کیے تھے۔ وہ دوستی کے مفہوم سے نابلد تھی۔ مگر اب۔ دوستی کا مفہوم اسے آگیا تھا۔ کتنی دفعہ اس نے اپنی ڈھکی چھپی محبت اس کی بے بضاعت ہستی کو عطا کی تھی۔ اب وہ دونوں عمر کی اس منزل میں تھے جہاں بہت سی بے معنی باتوں کے بھی معنی پیدا ہو جاتے ہیں!۔ صنوبیہ کو اپنی بلند مرتبہ حیثیت اپنے حسب نسب اپنے ذی اثر خاندان کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ انسانوں کو ایک ہی معیار پر رکھتی تھی اور ایاز تو خود کو نہایت کمتر، حقیر اور بے نسب سمجھ کر حد سے زیادہ محتاط رہتا تھا۔ لیکن وہ دل و دماغ تو بہرحال رکھتا تھا۔ اور دل میں پیدا ہونے والے اچھے برے خیالوں پر بھی اس کا قابو نہ تھا۔ مگر اس کے لبوں پر مضبوط قفل پڑے ہوئے تھے۔ وہ سلگ سلگ کر کلپ کلپ کر بالآخر مر جاتا۔ مگر کبھی اس کی زبان سے یہ حقیقت نہ نکلتی کہ صنوبیہ اگر اس کی زندگی تھی تو اس کا دین ایمان بھی۔

لیکن یہ سلوک۔ وہ بے اعتنائی، تخاطب کا طنزیہ انداز۔ وہ استہزا، اور برہمی۔ کیوں تھی۔ کیوں تھی؟۔ وہ پاگل ہوا جا رہا تھا!۔

"آ سکتا ہوں۔؟" شکیب نے کمرے کے اندر پہونچ کر اجازت طلب کی تفکر و اضطراب کا غبار چہرے سے صاف کرکے وہ بڑی بہادری سے مسکرا دیا۔

"اگر میں کہہ دوں کہ نہیں آ سکتے۔ تو؟"

"تو میں تمہارا شکریہ ادا کرکے آرام سے اس کرسی پر رونق افروز ہو جاؤں گا"

شکیب نے کہا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا!۔ رومال نکال کر چہرے پر بہتا ہوا پسینہ پونچھا اور سر اٹھا کر کھپریل کی چھت کو گھورتا ہوا بولا۔

ادھر ادھر کے لونڈوں کو ٹیوشن کے بہانے اور کبھی او دھا کر کے کم سے کم پانچ سو تو بنا ہی لیتے ہو۔ مگر دوستوں کے آرام کی خاطر چھت کا سیلنگ فین نہیں لگوا لیتے "۔

سیلنگ فین چھت ہی میں لگتا ہے میاں " ایاز ہنسنے لگا "یہی تو کہتے ہیں کہ جاہلوں پر لاکھ پالش کرو۔ ایک نہ ایک دن قلعی کھل ہی جاتی ہے!"

اچھا بھائی تم بڑے ارسطو سہی " شکیب نے کہا " میں نے سنا کہ تمھارے سر میں درد ہے کھانا نہیں کھا رہے۔ تو پھر میرا کیا ہوگا جو میں یہاں کے تورمے کے لالچ میں بے کھائے پیے بھاگ آیا ہوں!"

" یونہی سوکھو گے کیونکہ اب میں کھانا تو منگوا نہیں سکتا!"

چلو پھر ہوٹل پریسیڈنٹ چلیں!"

جاؤ تم۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔ ارے کیسے کنگلے ہو۔ بھابی نے کھانا نہیں دیا کیا نگوڑی تمھاری کالی زبان " شکیب نے دانت پیس کر کہا " بھابی کہاں سے آئی تم نے پہلے ہی مارے جلن کے ہونٹس کے دھر دیا تھا۔ وہی بات ہوئی کہ سانپ بھی نہ مرا لاٹھی بھی ٹوٹ گئی۔ ہونے والے سسر نے کہلوا دیا۔ بے روزگار لڑکے کو بیٹی نہیں دی جا سکتی۔ ایسی کون سی ان کی بیٹی ہیرے موتی چباتی۔ ارے اپنے دو نوالوں میں، میں اپنی پیاری بیگم کو بھی شریک کر لیتا"

میاں امتحان کی فکر کرو۔ پرسوں سے ہے " ایاز ہنسنے لگا۔

کیا تمھاری چاند سی شکل پر اسی فکر سے بارہ بجے ہوئے ہیں!۔

نہیں تو۔!" وہ گڑبڑا گیا۔

کہہ دو دل کی بات۔ یاد رکھو۔ میرے سوا تمہارا کوئی ہمدرد اور غم خوار نہیں ہے۔ میاں میں صورت دیکھ کر دل کی حالت کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ آج تم پر ۔۔۔ر کو ئو ۔۔۔ افتاد پڑی ہے۔" شکیب نے کہا اور پھر شعر عرض کر دیا۔

"صورت بہیں حالت میں ہیں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔ ہے کہ نہیں یہی بات؟" اور پھر احمقانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

ایاز جو اپنی چھوٹی سی زندگی میں پہاڑ سی فکروں، ندامتوں اور پریشانیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ تمام کی تمام صنوبیہ کی رتی بھر بے رخی کے سامنے ۔۔۔ر ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ اتنا ہی بے قرار تھا کہ صنوبیہ کے طنز و تعریض اور بے ۔۔۔ری کی بات شکیب سے کہہ دی۔ اور ہمہ تن اضطراب و تملق بن کر بیٹھ گیا۔ جواب ۔۔۔ں شکیب نے کہا۔

"تم یونہی احمق ہو۔ نجانے اس نے مذاق کیا ہے کہ کیا۔ تم اسے دوسری شکل ۔۔۔یں دیکھ رہے ہو۔ اماں۔ پوچھ ہی جو لیتے اس سے۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ میں ۔۔۔انتا ہوں۔ کتنی بار ملا ہوں۔ ایسی سلجھی ہوئی سمجھدار باتیں کرتی ہے کہ وہ کہیں اور ۔۔۔یا کرے کوئی۔ اچھا اگر ہمت ہو تو اسے بلاؤ۔ میں پوچھتا ہوں!"

"نہیں بالکل نہیں! بات اگر واقعی بے بنیاد ہو گی تو میں پوچھ گچھ کی پالش ۔۔۔ر کے اسے مضبوط بنانا نہیں چاہتا۔" ایاز نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اور پھر مجھے کیا ۔۔۔وہ اپنے فعل و قول کی مختار ہے۔ مجھے کون سا عمر بھر یہاں رہنا ہے۔ یہ تو ۔۔۔واہ مخواہ ڈیڈ صاحب نے اپنی قسم کی زنجیر میرے پیروں میں ڈال رکھی ہے ۔۔۔خراب میں اس قسم کو توڑ دوں گا۔ ایک سال میرا باقی ہے۔ امتحان دینے ۔۔۔ے بعد میں چلا جاؤں گا!"

"تو اس میں بسورنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلے جاؤ۔" شکیب نے لاپرواہی

سے کہا: "ماشاء اللہ تمہارے منہ پر بچے کا گھونسلا ہے۔ کلائی چوڑی ہے اور غالباً مرد بھی ہو۔ نکلو باہر۔ محنت کی روٹی پیدا کرو۔ اس طرح کندھے ڈال دینے اور تیری میری ایک ایک بات پر گھنٹوں واویلا کرنے سے کوئی کام نہیں ہونے کا۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" ایاز کے چہرے پر ایک رنگ سا آگیا۔ "اب میں تمہارا ہی کہنا کروں گا۔"

"میرا دولت خانہ حاضر ہے۔" شکیب نے کہا۔ "یہاں سے بوریہ بندھنا اٹھاؤ اور چلو میرے ساتھ۔ بیوی نہ سہی۔ تم ہی سہی۔ ظاہر ہے کہ حلق سے نوالہ کھینچ کر تمہی نگلو گے!"

ایاز بے دلی سے مسکرایا۔ دفعتہً وہاں غفور آیا۔ اور دونوں چپ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"بڑے سرکار فوراً آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ایاز اٹھ کھڑا ہوا۔ شکیب بھی اٹھ گیا۔

"پھر ملوں گا۔ اب چلتا ہوں۔"

بیگم صاحب کے چہرے پر عجیب سا تکدر تھا۔ ان کے پاس سب تھے۔ اور جیسے ہی وہ ان کے قریب پہونچا۔ کئی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا دل دھڑکا۔ وہاں ارقم اور جبیر بھی تھے۔ ان کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ صنوبر سہ پہر کی چائے سرد کر رہی تھی۔ ٹی وی کے قریب صنوبیہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کے اس کی طرف دیکھا تک نہیں! ایاز کے دل پر پھر چوٹ پڑی۔

"فرمائیے۔ بڑے صاحب!" اس نے پپڑی بندھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

میاں کیا فرماؤں "۔ اس کے چہرے پر نظریں گڑوتے ہوئے سید صاحب نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمھارے ساتھ جاکے رقم لایا تھا۔ اب یاد نہیں آرہا کہ وہ پورے ڈھائی ہزار میں نے جیب میں رکھے بھی تھے کہ نہیں۔!

"کیوں۔ کیا ہوا" ایاز کا دل اپنی دھڑکنیں بھولنے لگا۔

"ہونا کیا" سید صاحب نے کہا۔ "کل والی شیروانی کی ساری جیبیں دیکھ ڈالیں۔ قمیص کی جیب دیکھی مگر کسی میں ایک نیا پیسہ بھی نہ ملا۔ اب میں مکان کا ٹیکس کہاں سے دوں گا۔ جنس کیسے ڈلواؤں گا۔ ایاز۔ بیٹے۔ یاد کرو۔ بینک میں رقم گن کر تم نے مجھے دی تھی کہ وہیں کاؤنٹر پر چھوڑ دی تھی؟ میری عقل چکر میں ہے۔!

اکی حلق یوں خشک تھی جیسے مٹھی بھر آٹے کی پھنکی مار لی ہو۔ تقریباً بیس بائیس آنکھیں تھیں جو اسے ایک ساتھ گھور رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس نے آواز حلق سے نکالی۔

"ہم۔ میں نے تو تبھی پوری رقم آپ کو دے دی تھی۔ آپ نے اپنی کالی شیروانی کی اوپری جیب میں رکھ لی تھی۔ آپ نے اچھی طرح۔ ساری جیبیں دیکھیں کہ نہیں؟"

"اچھی طرح۔!" انھوں نے گہری سانس لی۔ "معلوم نہیں۔ راستے میں نوٹ گر گئے کہ کیا ہوا۔ مشکل تو یہ درپیش ہے کہ مکان کا ٹیکس سر پر سوار ہے۔ ہفتہ بھر بعد رقم بھرنی ہے۔ اور میں فقیر پورا روپیہ نکال لایا تھا۔!

"نانا ابا آپ مجھے لے جاتے!۔" جبیر زبان سے بولا۔ "مگر آپ نے مجھ پر کبھی اعتبار نہیں کیا۔ میرے مقابلہ میں کیا آپ کسی باہری آدمی کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں!؟"

"سنا ہے کہ کل صنوبر کو انھوں نے دس روپے انعام دیے تھے کسی بات کے میں نے کچھ اڑتی اڑتی سُنی تھی" ارقم نے بھی بہت آہستہ سے کہا "میں برآمدے کے نیچے کھڑا تھا۔ تبھی انھوں نے صنوبیہ سے کہا تھا کہ انھیں دس کا نوٹ پڑا ملا تھا۔!

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں بھلا صنوبر کو انعام کیوں دیتا؟" جبیرؔ کی زبادتی سے پاگل ہو کر ایاز نے کہا اور سب پر نظریں دوڑائیں۔ ان سب کے چہروں پر عجیب عجیب تاثرات دکھائی دیے۔ کوئی متاسف تھا کوئی خاموش کوئی متبسم۔ اخیر میں اس کی نظریں صنوبیہ کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر سفیدی اور نیلاہٹ کا امتزاج تھا۔ اور صاف ظاہر تھا کہ وہ خود بھی معاملہ سمجھنے سے قاصر تھی اور گھبرا رہی تھی۔!

"صنوبر مرادون پیٹی ایک نمبر کی جھوٹی ہے" بیگم نے کہا "کہیں سے نوٹ پڑا ملا ہوگا اور اس نے ایاز کا نام لے دیا۔!"

"سوال یہ ہے نانی اماں کہ ہار اکسی کا نام کیوں نہ لے دیا۔ اسے ایاز صاحب ہی ملے تھے" جبیر نے کہا۔

"بلائیے صنوبر کو اور پوچھیے" ارقم بولا۔

"نہیں!" اچانک صنوبیہ بول پڑی "مت بلایئے اسے۔ کسی بڑے معاملہ میں ملازموں کا دخل نہیں ہو سکتا! صنوبر کو یہاں مت بلاؤ۔ اور۔ ارقم صاحب اور بھیا۔ تم لوگوں کو ابی جی کے معاملہ میں منھ کھولنے کی اجازت کس نے دی ہے؟۔ ابی جی۔ کیا یہ عدالت ہے۔ آپ سب کے سامنے یہ سب کچھ کیوں کہتے ہیں۔ اکیلے میں آپ نے کیوں نہیں پوچھ لیا۔!"

جبیر نے قہر آلود نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔ ارقم پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

سید صاحب نے کہا: ہاں۔ سچ ہے۔ اس طرح معاملہ سلجھنے کے بجائے اور بگڑ جائے گا۔ ایاز! ۔ تم اکیلے میں یاد کرو کہ رقم کہاں گئی۔ میں بھی تب تک سوچتا ہوں!۔"

ایاز آپ کے پیسے نہیں لے سکتا!" بیگم نے دو ٹوک فیصلہ کر دیا: "اس کے خود پیسے میرے پاس جمع ہیں۔ اس نے آج تک مطالبہ نہیں کیا۔ ڈھائی ہزار ایسی کون سی بڑی چیز ہے جس کے لیے وہ ایمان خراب کرتا: پھر وہ میاں سے بولیں: "آپ ہی نے کہیں کھوئے ہیں۔ اب یاد کیا کیجیے گا پتہ نہیں جیب سے راستے میں کہاں گرے ہیں۔ کسے مل گئے ہیں۔ اب وہ نہیں مل سکتے۔ ٹیکس کی رقم کا کچھ اور بندوبست کرنا چاہیے۔ اتنی معمولی چیز کے لیے طبیعت مت خراب کیجئے۔ پہلے ہی آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے!"

اچھا۔ اب تم سب جاؤ۔ میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں: سید صاحب بولے پھر بیوی سے مخاطب ہوئے: مجھے بتاؤ کہ تم کر دگی ٹیکس کا انتظام۔

ہاں کر دوں گی" انھوں نے ہاتھ ہلا کر معاملہ ختم کر دیا: میرے پاس ایاز اور عمرانہ کے پیسے جمع ہیں۔ سرکاری آدمی آئے گا اسے دے دوں گی۔ ان لوگوں کو ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کچھ مت سوچئے۔ آرام کیجیے"

میں تو چاہتا ہوں کہ پھوپھی جان سب کی تلاشی لے لیں": ارقم بولا۔

ایاز ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ وہ ویران نظروں سے اسے تکنے لگا!۔

"تو آپ کو یقین ہے کہ تلاشی میں کہیں نہ کہیں روپیہ نکل ہی آئے گا" صنوبیہ پھر بولی۔

مجھے بتاؤ کہ پھر جیب سے پیسے کہاں گئے؟": ارقم بحث پر تل گیا" اور تم اس غلام کی حمایت کیوں کرتی ہو۔

ارقم تم حد سے باہر نہ نکلا کرو" چھوٹی بھابی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آخر ابی جی کے کسی معاملہ میں تمھارا کیا دخل ہے؟ تم کیوں ٹپک پڑتے ہو۔؟"

امی جی۔ شک تو سب پر جا تا ہے" جبیر بھی بولا۔

"تم پر نہیں جا رہا ہے۔ تم پریشان مت ہو" صنوبیہ پھر بولی۔

"اور تم کیوں وکیل بنی ہوئی ہو؟" جبیر نے کہا۔

"مجھے چونکہ بیکار بکواس پسند نہیں ہے۔ میں شروع سے ابی جی اور ایاز کے ساتھ رہی ہوں۔ تم باہر جھک مارتے پھرے ہو" صنوبیہ نے جواب دیا۔

"بھئی میں نے کیس ختم کر دیا" سید صاحب خانہ جنگی سے گھبرا کر بولے "تمھاری والدہ نے میری پریشانی ختم کر دی۔ مطلب یہ کہ سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔ تو پھر تم لوگ آپس میں کیوں الجھ رہے ہو؟"

"بڑے صاحب! ارقم صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں" ایاز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "آپ میری تلاشی لے لیجئے۔ میں آپ کے ساتھ گیا تھا۔ بینک میں رقم میں نے گنی تھی۔ گھر تک آپ کے ساتھ آیا تھا اور پھر یہیں ٹھہرا رہا تھا آپ بے شک میرے سامان اور کمرے کی تلاشی لے لیجئے۔! سب کو اطمینان ہو جائے!"

وہ چپ رہے!۔

"میرے پاس صرف ایک ٹرنک ہے۔ وہ آپ غفور سے منگوا لیجئے" ایاز نے کہا۔ چونکہ اس کا دل صاف تھا۔ اور اسے پتہ تھا کہ رقم اس نے چھوئی بھی نہیں تھی۔ لہذا وہ دلیر ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی غفور سے کہا کہ دیوار گیر الماری میں اس کا ٹرنک رکھا ہے وہ لے آئے!۔ اور اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب یہاں نہیں رہے گا! وہ کسی کا محتاج نہ رہا تھا۔ ان

سب کے احسانات بے شک اس پر بہت تھے۔ مگر اب وہ کچھ نہ کچھ کما رہا تھا۔ روٹی نمک کے لیے اس کے پاس کافی تھا! اتنی سخت اہانت اور توہین کے بعد یہاں اس کا قیام و طعام سخت بے حیائی ہوتی!۔

غفور ٹرنک اٹھا لایا۔

"ارے یہ کیا بیہودگی ہے" بیگ صاحب نے ڈانٹا "ایاز۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔ میں یہ حرکتیں پسند نہیں کرتا!"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پانی کی چادر کے پیچھے سے اسے ساری دنیا لرزتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ آخر اس پر یہ وقت آیا تھا۔ بڑے جذبے سے اس نے ٹرنک کھولا اور اسے زمین پر الٹ دیا۔ عمرانہ کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی اور ایاز بھی بے ارادہ اچھل پڑا۔ کیونکہ ٹرنک کے الٹتے ہوئے زمین پر نوٹوں کی بارش ہو گئی تھی۔ چونکہ پنکھا فل اسپیڈ میں چل رہا تھا۔ لہذا تیز ہواؤں میں دس دس کے نوٹ ردی کے پرزوں کی طرح سارے میں اڑ کر بکھر گئے!

"یہ کیا؟" تقریباً سب کی زبانوں سے نکلا۔ اور ایاز کا یہ حال تھا کہ بدن میں لہو نہ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے رنگین لہریے تلملانے لگے تھے اور سر یکبارگی اتنی زور سے چکرایا تھا کہ وہ کرسی کی پشت تھامتے تھامتے لڑکھڑا کر فرش پر آ رہا۔

صدیوں بعد جب وہ ہوش کی دنیا میں واپس آیا۔ تب۔ سوچنے لگا کہ اسے ہوش کیوں آیا۔ موت کیوں نہ آ گئی؟

وہ اپنے کمرے میں تھا! یہاں کیسے آ گیا تھا۔ وہ سمجھنے سے عاری ہو گیا۔ اسے یہاں کون پہنچ گیا تھا؟۔

وہاں کوئی بھی لایا ہو۔ لیکن سب سے بڑا سوالیہ نشان جو اس کے سامنے ایستادہ تھا وہ یہ تھا کہ اس کے سوٹ کیس میں نوٹ کہاں سے آگئے تھے۔۔ جیبر نے نوٹ گنے تھے پورے دو ہزار چار سو نوے روپے نکلے تھے۔ اور ارقم نے ہنس کر کہا تھا کہ تعداد مکمل کرنے والا نوٹ کل اس نے صنوبر کو دیا تھا!۔

پرسش پر صنوبر نے اقرار کر لیا تھا۔! بیگم نے اس سے پوچھا تھا: "کیوں ری تجھے دس روپے کس نے دیے تھے۔؟

ایاز میاں نے!" سب کے سامنے صنوبر نے صاف صاف کہا۔

کیوں۔؟" بیگم نے کڑک کر پوچھا۔ ان کا رنگ پریدہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ

وہ بیگم ساب!" ہکلاتی اور کانپتی ہوئی صنوبر بولی: "ایاز میاں نے کہا تھا کہ۔ یہ پیسے رکھ لے۔ اور تو میرا کہا۔ مانے گی۔ تو۔ تو میں تجھے اور پیسے دوں گا!"

لاحول ولا قوۃ" سیّد صاحب کے منہ سے نکلا: "بیگم یہ میں کیا سن رہا ہوں۔

ایاز۔ اور ایسی باتیں کرے۔؟" ماجدہ نے حیرت کے مارے آنکھیں نکال کر اور سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

آدمی کب شیطان بن جاتا ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا!" جیبر بولا۔ ارقم مسکرا رہا تھا اس نے ایک گہری سانس لی اور رومال سے لب چھپا لیے۔

ممرانہ نے اٹھ کر رقم سمیٹی اور ماں کو دے دی وہ یوں ساکت و صامت بیٹھی تھیں جیسے کسی نے انھیں پتھر کا کر دیا ہو!۔ سیّد صاحب فرش کو گھور رہے تھے۔ ان کا رنگ سفید ہو رہا تھا!۔ پھر وہ خود سے بڑبڑائے۔

یقین نہیں آتا۔ دل نہیں مانتا!۔ ایاز نے ایسی رکیک حرکت کی ہے۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔ وہ اتنا شریف، کم سخن کم آمیز اور مکروہات دنیوی سے یکسر بادری ہے۔ اس پر شیطان یوں تسلط نہیں جما سکتا!۔ میں اس سے کیا پوچھوں۔ کس طرح پوچھوں!۔ میری تو زبان ہی نہیں ٹوٹے گی۔! یہ بہت برا ہوا۔ بہت برا!"

اپنی چوری اس نے آپ کیسے کھول دی"۔ بیگم نے دور کا نکتہ تلاش کر لیا۔ "اگر تنا شادو ناچھ نے یہ حرکت کی بھی تھی تو پیسے کہیں چھپا کر رکھتا۔ ہم سب کے سامنے تلاشی دے کر چور کیوں بنا!۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی!۔ نہیں۔ یہ کام اس کا نہیں۔ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ کچھ مغالطہ اور غلط فہمی کی بات ہے۔ میں اس سے پوچھوں گی"۔

آدمی ہی تو ہے۔!" جبیر نے بڑے تاسف سے کہا۔

آدمی ہی سب کچھ کر گزرتے ہیں"۔ صنوبیہ بولی۔

کیا مطلب؟" جبیر نے تیوری بدل کر پوچھا۔

مطلب یہ کہ اس قسم کی حرکتیں آدمی ہی کرتے ہیں"۔

صنوبیہ!۔ میں آئندہ نہ سنوں کہ تم اس لے پالک دو کوڑی کے غلام کی تائید میں بولی ہو۔!" جبیر کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

ہاں یہ کچھ نامناسب سا لگتا ہے!" ارقم بھی دبی زبان سے بولا۔

آپ لوگ ایک دوسرے کا آرگن مت بنیے"۔ صنوبیہ نے تلخ لہجہ میں کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

بیگم!" سید صاحب نے مردہ آواز میں کہا "جاؤ۔ تم پوچھو اس سے اور پھر مجھے جواب دو۔ ساری باتیں تفصیل سے مجھے سناؤ۔ جاؤ۔ مجھے کچھ تو سکون ہو۔

بیگم کا دل خود بھی مسوس رہا تھا۔ وہ معاملہ صاف کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ اپنے ساتھ ہاجرہ اور عمرانہ کو بھی لیتی گئیں۔ ایاز کا کمرہ کباڑ خانہ ہو رہا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ بنا ہوا وہ خود بھی گھورہ کچرہ لگ رہا تھا۔ بکھرے ہوئے بال، گھنی مونچھیں، سرخ آنکھیں اور میلا سا لباس، ان تینوں کو دیکھ کر وہ سسک اٹھا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

"یہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اماں۔ میں خدا کی قسم کچھ نہیں جانتا! میں نے پورے پیسے بڑے صاحب کو دے دیے تھے۔ پھر وہ میرے صندوق سے کیسے نکل آئے۔ یہ کون سا جادو ہے۔ میں بڑی دیر سے یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا میں کابوس کا بیمار ہو گیا ہوں۔ جو کچھ میں کر گزرتا ہوں۔ اس کا شعور مجھے نہیں ہوتا! میں حلف لیتا ہوں۔ ہوش کی حالت میں ایسا رکیک کام میں کبھی نہ کرتا۔ کل دوپہر کو میں سو گیا تھا۔ شاید نیند کی بیہوشی میں ایسا میں نے کر دیا ہو۔ ورنہ پوری رقم آخر میرے ٹرنک ہی سے کیسے نکلتی؟"

پاگل۔ اپنے منہ سے کیوں چوری کا اقرار کر رہا ہے۔؟" ہاجرہ بولیں اس کے پھلوٹ پھوٹ کر رونے سے وہ پگھل رہی تھیں۔

"پھر میں کیا کروں۔ کتنا شرمندہ ہوا ہوں میں" وہ ہچکیاں لیتا ہوا بولا: "بڑے صاحب کی نظروں سے میں گر گیا۔ آپ سب کیا سوچیں گے۔ ایاز چور نکلا۔ میرے لیے ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اماں۔ آپ مجھے بچپن ہی سے جانتی ہیں۔ کیا میں سچ مچ نیند میں چلتا ہوں۔؟"

نہیں" بے خیالی میں بیگم نے کہا۔

اچھا ایاز۔ سچ سچ بتاؤ۔ تم نے کون سا کام صنوبر سے لیا تھا۔ اسے دس

روپے کیوں دیے تھے"۔ ابکی عمرانہ نے پوچھا " اسے تم نے بلایا ہی کیوں تھا۔؟"
میں نے اسے نہیں بلایا۔ عمرانہ بی بی"۔ وہ بڑی سادگی اور معصومیت سے
بولا۔ میرا تو کوئی ایسا کام ہی نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جھاڑو تک میں خود
دے لیتا ہوں۔ غفور سے بھی نہیں کہتا۔ پھر میں صنوبر سے کون سا کام ایسا لوں
گا جس کا انعام دس روپے دوں۔ نہیں۔ میرے پاس تو کبھی چائے پینے کے
لیے بھی ایک روپیہ نہیں نکلتا۔ آپ خود سوچیئے۔!"

اور وہ جو کچھ سوچ رہی تھیں۔ اس تک ایاز کا دماغ نہیں پہونچ رہا تھا۔ تینوں
سنجیدہ، شریف اور معمر خواتین اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بدستور پہلے کا سا
تھا۔ کسی جرم یا گناہ کی ہلکی سی سیاہی تک اس کے چہرے پر نہ تھی۔!

"تو پھر صنوبر کیوں کہتی ہے کہ اسے تم نے انعام دیا تھا؟" جھلا کر ہاجرہ نے
پوچھا۔ "صنوبر کہتی ہے؟" ایاز نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں۔

"ہاں"

وہ جھوٹ بولتی ہے۔ ہاجرہ بی بی۔ میں اماں کی قسم کھاتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم
کہ صنوبر یہ کیوں کہتی ہے"

"یہ کچھ اور گورکھ دھندہ ہے۔" بیگم نے پر خیال انداز میں کہا۔

اب ایاز کا دل زندگی ہی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے اس کی مطلقاً پروا
نہ تھی کہ اس پر الزام لگے تھے۔ اسے تو بس صنوبیہ کی بے رخی کا زہر آہستہ آہستہ
مار رہا تھا۔ اب نہ وہ اس کا التفات تھا نہ توجہ۔ وہ بالکل انجان ہو گئی تھی۔

آج کل اس کے امتحانات ہو رہے تھے۔ وہ بھی اکنومکس اور کامرس کی طالب علم تھی اور اکثر ان مضامین میں ایاز نے اس کی مدد کی تھی۔ ساری ساری رات بیٹھ کر اس کے لیے گس پیپر کے جوابات لکھے تھے۔ نوٹس بنا کر دیے تھے۔ لیکن اب اس نے دوسروں سے سنا تھا کہ پرچے بہت مشکل آئے تھے۔ مگر صنوبیہ نے اس سے کوئی مدد نہ مانگی تھی۔ اس کی خود ہی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ اپنی طرف سے کچھ پوچھتا۔ اس کے خود بھی امتحانات ہونے والے تھے لیکن وہ سوچ رہا تھا۔ اب کیا کرے گا امتحان دے کے۔ ایسے ڈگریاں لے کر کیا کرنا تھا۔ کسی مہربان ہستی سے وابستگی کا تصور ہی آدمی کے لیے بہت بڑی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتا ہے۔ کسی کے خیالوں میں رہنے کا گمان ہی کتنا اوج پرور ہوتا ہے۔ یہاں اب کچھ نہ تھا۔ وہ باغ اجڑ چکا تھا جس میں ارمانوں کی کونپلوں نے ابھی سر ہی ابھارا تھا۔ وہ خواب یکبارگی بکھر چکے تھے۔ جو ہمیشہ اسے ایک انوکھی دنیا میں پہونچا دیتے تھے۔ وہ بے تعبیر تھے۔ مگر بہت حسین تھے۔ اب وہ منہ چڑھا کر بھاگ نکلے تھے۔ دنیا ایک بے آب و گیاہ صحرا تھی۔ منزل کہیں نہ تھی۔ اور اسے بے مقصد چلنا تھا۔ تو پھر وہ کیوں چلتا۔ یہ تو اسے ازل ہی سے معلوم تھا کہ وہ ایک بے نام و نشان شخص تھا۔ خود رو۔ ناجائز، غیر قانونی، راندہ درگاہ، جو پالتو جانوروں سے بھی بدتر و حقیر تھا۔ بھلا وہ صنوبیہ تک پہونچنے کا خیال بھی کیونکر کر سکتا تھا۔ صنوبیہ اگر عرش تھی تو وہ فرش۔ اس کی طلب ہی گناہ تھا۔ پاگل پن، مضحکہ خیز بات لیکن اپنے خیالوں میں صنوبیہ کو چپکے چپکے چاہے جانے سے اسے کون روک سکتا تھا۔ صنوبیہ اس کے دل کے تہہ خانے میں چھپی بیٹھی تھی۔ صنوبیہ اس کے دماغ کی تاریک کوٹھڑی میں پوشیدہ تھی۔ صنوبیہ خون بن کر اس کی رگوں

بیں بہ داں دوال تھی۔ صنوبیہ اس کی روح تھی۔ صنوبیہ ہی کا تصور اسے زندہ رکھے ہوئے تھا!۔ اس نے بھولے سے بھی اپنی کسی حرکت سے صنوبیہ کو شبہہ میں میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ بس وہ اس کا دیوانہ یوں تھا کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے صنوبیہ کو ہمیشہ دیکھا کرتا۔ اس کی شیریں آواز سنا کرتا۔ وہ جہاں جاتی وہ بھی وہیں پہونچ جاتا!۔ وہ صنوبیہ کا سایہ تھا!۔

اور اب۔ اکیلے کمرے میں دروازہ بند کیے وہ کمزور لڑکوں اور بوڑھی لڑکیوں کی طرح آنسو بہا رہا تھا!۔ آج اسے اپنی زندگی میں ایک بھیانک خلا نظر آرہا تھا۔ آج ہی اسے پتہ چلا تھا کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ آج تک وہ کسی بھول میں پڑا تھا۔ دوسروں کے خلوص پر اس نے اندھا بھروسہ کر لیا تھا مگر دوسرے ہمیشہ دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ جب تک جی چاہا۔ پیار اور محبت کا اظہار کیا۔ جب جی چاہا اپنا پیار واپس لے لیا۔ آج صحیح معنوں میں اس کے دل کا خون آنکھوں سے بہہ رہا تھا!۔ آج وہ ننھے سے بچے کی طرح اپنی ان دیکھی ظالم ستمگر ماں کو پکار رہا تھا۔ بے درد جلاد باپ کو آواز دے رہا تھا کسی دوست کو سہارا دینے کے لیے بلا رہا تھا۔ اور اپنی محبت کو واپس مانگ رہا تھا۔ مگر اسے کچھ بھی نہ ملا۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔ کسی ہمدرد ہستی کا آنچل اس کے آنسو پونچھنے کے لیے آگے نہ بڑھا۔

پاگلوں دیوانوں کی طرح وہ فرش پر بیٹھا پلنگ کی پٹی پر سر ٹیکے رو رہا تھا۔ اس کے آنسو چٹائی پر گر رہے تھے۔ اور وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اتنا بیتاب ہو کر کیوں رو رہا تھا۔ صنوبیہ تو اس کی دسترس سے یوں بھی بہت دور تھی۔ صنوبیہ کو اس کے جذبات اور احساسات کا کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ تو پھر یہ زبان حال سے شکوہ کس کے سلوک کا تھا؟۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے یہاں سے چلے جانا ہے کہاں۔ کدھر۔ یہ تو گھر سے نکلنے کے بعد معلوم ہو گا۔

اس نے کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد دل قابو میں کیا اور زیر لب کہا بیگانہ سا یہاں آیا تھا۔ بیگانہ سا چلا جاؤں گا۔ صنوبیہ سے محبت یکطرفہ پاگل پن ہے اسے تو کچھ خبر ہی نہیں۔ کون اس کی راہوں میں پڑا پھرتا ہے۔ اس نے ادھر ادھر کھونٹیوں پر ٹنگے کپڑے اتارے اور انھیں ٹرنک میں ٹھونس دیے۔ پھر کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ جیب میں ایک کانی کوڑی بھی نہیں ہے۔ جائے تو کہاں جائے۔ بے شک اماں کے پاس اس کا کچھ روپیہ رکھا تھا لیکن اس بڑے حادثے کے بعد ان سے اپنی رقم کا مطالبہ کرنا بڑی بے شرمی ہے کیا سب کے خیالات اس کی طرف سے خراب نہیں ہو گئے۔ اماں اور رشید صاحب کیا سوچیں گے؟ کیا کہیں گے۔ نہیں۔ ان سے کچھ کہنا اچھا نہیں۔ ان سے ملنا بھی اچھا نہیں۔ بس چپ چاپ چل دینا بہتر ہے۔ اس کا ہے ہی کون جو اس کی غیر حاضری کا ماتم کرے گا۔ خس کم جہاں پاک۔ بس اب الوداع۔

اس نے دروازہ کھولا اور ایک ہوک سی دل میں اٹھی۔ یہ چھوٹا سا پائیں باغ کتنا ویران اور اجڑا ہوا تھا۔ اسے اس نے خون جگر سے سینچا تھا۔ جانے کہاں کہاں سے پھول پودے لایا تھا۔ زمین گوڑی تھی۔ نلائی کی تھی۔ نرسری کے نگراں کار کی خوشامد کر کے گملے لایا تھا۔ اس زمین کی ساری سر سبزی اس کی محنت کی رہین منت ہے۔ اس نے خزاں زدہ درختوں پر نظریں دوڑائیں۔ اب تو خشک ٹہنیوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔ ایک دفعہ پھر یہ جھاڑیوں کے سے درخت سر سبز برگ و بار سے لد جائیں گے۔ ایک بار پھر یہاں بہار آئے گی۔ مگر وہ یہاں نہ ہو گا۔

جانے کہاں ہوگا۔ اسے یہ خاموش کھڑے ہوئے درخت زمین دوز پودے
بیلوں کے جھنڈ اور منڈوے اپنے ساتھ ساتھ روتے معلوم ہوئے۔ یوں
لگا اگر کچھ دیر اسی طرح کھڑا رہے گا تو اس کا دل تھم جائے گا وہ پھر
اندر چلا گیا اور پلنگ پر بیٹھ کر سر تھام لیا۔ اس کی کنپٹیاں چٹخ رہی تھیں۔

خدا کی پناہ۔ یہ ہوا کیا تھا۔ صنوبر نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ اس نے
اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ارقم اور جبیر اس کے مخالف کیوں ہو رہے تھے۔
وہ اس سے یوں ہی کہتے وہ ان کے گھر سے چلا جاتا۔ کیا اس کم حقیقت
آدمی کا اتنا حوصلہ تھا کہ وہ ان کی راہ میں آنے کی جسارت کرسکتا!

سوچتے سوچتے وہ پاگل ہونے لگا! اور خود پر گزرے ہوئے حادثے
کا کوئی سرا اس کی گرفت میں نہ آسکا!

اگر اب تک پاگل نہ تھا تو اب ہو جاؤں گا۔ اس نے اپنے الجھے الجھے
بال مٹھی میں جکڑ لیے اور دانت پر دانت جکڑ کر بڑبڑایا۔

"تو پھر خبیث نکمے بزدل تو آخر یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتا؟
کیا کسی اور واقعہ کا انتظار کر رہا ہے؟"

کل میرا سالانہ امتحان شروع ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟ ارے۔
لعنت بھیجو امتحان پر۔ کون سا تمہیں پڑھ لکھ کر کہیں کا گورنر بننا ہے۔ اب
تو سلام کیا پڑھائی کو۔ اچھا میری تقدیر۔ تو مجھے ستانے پر تلی ہے نا۔ دیکھ
ناہنجار۔ میں بھی اب رکشا چلا کر تجھے ذلیل کردوں گا! یہی سہی۔ تیری ہی
جیت سہی۔ ٹھہر جا۔

وہ اپنی جگہ پاگلوں کی سی بکواس کر رہا تھا۔ اور ارقم کے کمرے میں
دوسری ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ ارقم ہنس رہا تھا اور سرگوشی میں

کہہ رہا تھا۔

"بہار۔ معاملہ تو توقع سے زیادہ خوبی سے نپٹ گیا۔ یہ ناشدنی صنوبر اندازے سے زیادہ سمجھدار نکلی۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ پوچھ گچھ میں ٹوٹ نہ جائے۔ مگر کیا صفائی سے اس نے مسٹر ریانہ کا نام لیا ہے کہ میں تو پھڑک اٹھا۔ اور بھائی اب تم راضی ہو تو اگلا پارٹ بھی ڈرامہ کا بس ہو ہی جائے۔ جب ہم کھلے عام سیٹھ صاحب کی مخالفت نہیں کر سکتے تو یونہی سہی۔ اگیا خیال ہے۔"

میاں۔ معاملہ میری بہن کا ہے۔ سمجھے۔" جبیر بولا " اور وہ نمبر ایک تیز طرار اور غصہ ور واقع ہوئی ہیں۔ سوچ سمجھ کے اگلا قدم اٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ گھٹالا ہو جائے اور ابا صاحب قبلہ کے بجائے ہمی کو جلا وطنی نصیب ہو جائے۔ سنو ارقم بھائی۔ میں تو اب بہت جلد یہاں سے جانے والا ہوں۔ تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ ایسا نہ ہو کہ مارے جاؤ۔ کیا سمجھے؟"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ فوراً اور جلد اس تماشے کا ڈراپ سین کردو" ارقم نے پرتشویش لہجے میں کہا "یار۔ مگر تمہاری بہن۔ معاف کرنا۔ اگر وہ راضی ہوتی نا تو مجھے اس ڈرامہ کی ضرورت ہی نہ تھی! تم بھی اسے راضی نہ کر سکے!۔ واہ"

"تمہی اسے راہ پر نہ لا سکیں" جبیر منہ سکوڑ کر بولا "وہی مرغے کی ایک ٹانگ الاپے جاتی ہے۔ ملازمت کرے گی۔ شادی نہ کرے گی۔ یہ کوئی بات ہوئی تم سے رشتہ داری ہے۔ تم جانے پہچانے ہو۔ اسے خوش رکھ سکو گے۔ مگر عورت کی ناقص العقلی۔ جی چاہتا ہے کہ سونٹ کے رکھ دوں!"

"خیر تو سنو" ارقم نے کہا "میں نے یہ پرزہ خط لکھ لیا ہے۔ اس کا مضمون دیکھ لو تو صنوبر کے ہاتھ سے صنوبیہ کو بھجوا دیا جائے۔ مزہ آجائے گا۔ وہ ایا نکی

طلبی پر اس کے پاس پہونچے گی۔ باتیں ہوں گی۔ تنہائی ہوگی۔ اور ادھر تم سید صاحب اور ان کی بیگم وغیرہ کو لے کر پہونچ جاتا کہ ملاحظہ فرمائیں گے آپ گھر میں عشق و محبت کا ناٹک ہوتا ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ تنہائی کی ان کی ملاقات سید صاحب وغیرہ ہرگز گوارہ نہ کریں گے۔ بس نوٹس مل جائے گی محترم ایاز صاحب کو۔ اور ادھر صنوبریہ کو پابند کرنے کی غرض سے جلد سے جلد بیاہ دیا جائے گا!۔ پروگرام کیسا ہے؟"

"ارقم بھیا۔ اچھی طرح سوچ لو۔ صنوبریہ پر تو کوئی آنچ نہیں آئے گی؟"

جبیر نے کہا۔ وہ پھر بھائی تھا اور اسے صنوبریہ کی آبرو بہرحال عزیز تھی۔

ارقم نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا "کچھ نہیں۔ صنوبریہ کے وہاں پہونچنے کے بس پانچ ہی منٹ بعد میں سید صاحب، باجی اور پھوپھی جان کو لے کر آؤں گا۔"

"کہوگے کیا؟ تم جانو۔ حادثہ معمولی نہ ہوگا!"

"کہوں گا کیا؟" ارقم نے تعجب سے دہرایا "یہی کہوں گا کہ باغ میں ٹہلنے آیا تھا۔ ایاز کے کمرے میں کھسر پھسر سنی۔ دیکھا تو صنوبریہ تھی۔ اب آپ لوگوں کو دکھانے لایا ہوں۔ اور کیا۔ بعد کو بڑے لوگ خود ہی آپس میں سمجھ بوجھ لیں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے ـــــ صنوبریہ تم سے بیاہ پر راضی ہو جائے گی!۔"

"ارے اسی ذلیل نے اپنی طرف کیا ہے جبیر۔ ورنہ وہ شروع ہی سے میرے ساتھ رہتی تھی۔ مجھ ہی سے منسوب بھی تھی۔ میری ہر بات ہر حکم مانتی تھی۔ مگر اس حرامزادے نے خدا جانے کون سا افسوں پڑھ کر پھونکا کہ اسی کا کلمہ پڑھنے

لگی۔ تبھی سے مجھے اس نابکار سے نفرت ہو گئی ہے۔!

"خط دکھاؤ۔ مضمون کیا لکھا ہے۔!"

ارقم نے جیب سے ایک پرچہ نکال کر جبیر کو تھما دیا۔ لکھا تھا۔

پیاری صنوبیہ بی بی۔

مجھ پر رحم کیجئے۔ ترس کھائیے۔ آپ سے باتیں کیے جگ بیت گئے۔ اگر فرصت ہو تو کچھ دیر کے لیے میرے کمرے میں آجائیے۔ بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔!

ایاز

جبیر نے خاموشی سے خط اسے واپس کر دیا اور پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"سوادِ خط کیا صنوبیہ پہچانتی نہ ہوگی۔؟" ارقم ہنسنے لگا: "اچھی بات ہے ایک سطر اور بڑھائے دیتا ہوں کہ فرط اضطراب سے ہاتھ میں رعشہ آگیا ہے۔ قلم پر قابو نہیں رہ گیا ہے۔ پرواہ نہ کرنا۔

اچھا ہے۔ ایک پاپ ادھر کٹے۔ ایک الجھن سے ادھر نجات ملے۔ بلاؤ صنوبر کو اور اچھی طرح سمجھا دو۔ ماما پھر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں کسی کی ڈانٹ ڈپٹ سے ڈر کر راز کھول دے۔!

ارے۔ اُلّو کی پٹھی کو دس پانچ پکڑا کر چلتا کر دیں گے۔" ارقم بولا۔

دس پانچ۔ ہوش میں تو ہو۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کم بخت کہ پورے ایک ہزار پر بات پکی ہوئی ہے۔" جبیر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا: "کیا واقعی اسے ایک ہزار بخش دو گے؟"

کیا بدمعاش نے تم سے یہ بات کہہ دی تھی!"

"ہاں کہہ ہی تھی۔ جب ہم تینوں میں کوئی ایک معاملہ ہوتا ہے تو راز

تینوں کو معلوم ہونا چاہیئے۔ مجھ سے تم نے چھپایا کیوں تھا؟"۔ جبیر نے دیدے نکالے۔

چھپایا نہیں۔ ارقم کو غصہ تو بہت آرہا تھا مگر مصلحت سے نرم آواز میں بولا۔ میں تم سے تذکرہ کرنا بھول گیا ہوں گا۔

اچھا۔ خیر۔ وہ میرے دو ہزار کہاں ہیں۔ کل سارہ کا ٹیلی گرام آیا تھا۔ وہ مجھے فوراً بلا رہی ہے۔ اس کی ڈیلیوری کے وقت میرا اس کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ پریچ کیس ہے۔ آپریشن ہوگا۔ بھائی مجھے کاغذات پر سگنیچر کرنے ہوں گے!۔ اگر تم پیسہ دے دو تو میں جاؤں!"

ارقم کے سینے میں ہوا سمانے لگی۔ اس کی جیب میں دو روپے بھی نہ تھے مگر بات بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ رسانیت سے بولا "ضرور جاؤ۔ کل ہی پرسوں تم کو چیک دے دوں گا!۔ نقد کا انتظام نہیں کرسکتا کیونکہ نقد والد صاحب نے دینا بند کر دیا ہے۔! تم چیک لے لو۔ دو ایک دن میں کیش ہوجائے گا!

اچھا۔ تمھاری سہولت کی خاطر، چیک ہی سہی۔!

مگر تم ایک ہزار روپئے اس لالچی عورت کو کیسے دو گے؟۔

کیوں۔؟

ارے۔ خاصی بڑی رقم ہے۔

کام بھی بڑا لیا ہے اس سے۔

اگر بھانڈہ پھوڑ دے تو پھر۔

بھانڈہ نہ پھوڑنے ہی کی قیمت ہے میاں۔!۔

دونوں نے پھر کچھ سرگوشی کی۔ اور جبیر باہر نکلا۔ اسے صنوبر کی تلاش تھی وہ رات کے کھانے کے لیے تیاری کرتی مل گئی۔ چونکہ ایک ناپاک سازش میں

ان تینوں کی ملی بھگت تھی لہٰذا وہ خود بھی جبیر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے آنکھ سے اشارہ کیا اور ماں اور نانی کو سنانے کی خاطر اونچی آواز میں بولا۔

"ارقم کانی مانگ رہے ہیں۔ پہلے دے آؤ سمجھیں!"

چونکہ کسی کو کوئی شبہ نہ تھا اور وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس لیے صنوبر اطمینان سے ارقم کے پاس پہونچ گئی۔ موقعہ پا کر جبیر بھی آگیا۔ ارقم نے اسے خط کا پرزہ پکڑاتے ہوئے چپکے سے کہا: "صاحبزادی کو دے آؤ سمجھیں۔ کہنا کہ ایاز میاں نے دیا ہے۔ اگر کہیں میرا نام لے دیا تو پھر بہت برا حشر ہوگا! خبردار۔ تمھیں یونہی اتنے بہت سے پیسے نہیں دے رہا ہوں۔!"

"ارے یہ بہت ہوشیار ہے اپنا پہلا کام تو بہت اچھی طرح کر دکھایا ہے۔" جبیر نے خوشامد سے کہا۔

"مگر تم لوگ یہ دھندہ کاہے کو کرتا ہے صاحب؟" صنوبر نے کہا: "میں تو کسی سے کچھ بولنے بتانے کی نہیں۔ پر اپنا صاحبزادی بہت ہوشیار ہے۔ مجھے گھورتا ہے۔ ڈر لگتا ہے صاحب۔ اپنی بی بی سے خوف آتا ہے۔"

"بس یہ تمھارا آخری کام ہے۔ کچھ روز۔" ارقم نے کہا: "میں نے تمھیں صرف ایاز کا نام لے دینے کے عوض سو روپلے دیے ہیں۔ اور بھی دوں گا پھر تم عزے کرنا۔ چاہے یہاں رہنا چاہے چلی جانا۔ شاباش۔ یہ خط صاحبزادی کو دے کر صرف یہ کہہ کے آجاؤ کہ ایاز میاں نے دیا ہے۔ بس اتنا سا کام ہے!"

صنوبر خط لے کر چلی گئی۔ مغرب کا وقت تھا۔ عجیب سا اداس ماحول تھا سیّد صاحب مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ بیگم صاحبہ جانماز پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں

ہاجرہ اور عامرہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ عامرہ چند روز بعد اپنے شوہر کے پاس دمام جانے والی تھیں۔ اسی سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ہاجرہ اب بہت بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت میں کٹتا تھا۔ دنیاداری سے انھوں نے خود کو الگ کر لیا تھا۔ صرف ایک آرزو ان کی رہ گئی تھی کہ صنوبیہ کا گھر بس جائے تو وہ بیت اللہ شریف کا قصد کریں۔ یہ تمنا ان کی زندگی کی اتنی شدید تمنا تھی کہ وہ باقاعدہ صنوبیہ کی خوشامد پر اتر آئی تھیں۔ لیکن صنوبیہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کی زندگی بھی ناکام رہی تو پھر اسے کون سہارا دے گا۔ ہاجرہ کو ماں باپ اور بھائیوں نے سمیٹ لیا تھا۔ اس کے بھائی ناکارہ تھے۔ نانا نانی از کار رفتہ تھے۔ اسے کون پناہ دیگا لہٰذا وہ ملازمت کر کے ساری عمر تجرد ہی میں گذار دے گی!۔

صنوبیہ نے پرانا خوش مزاجی اور بذلہ سنجی کا چولا اتار پھینکا تھا۔ اب وہ انیس برس کی سنجیدہ اور محتاط دوشیزہ تھی!۔ ایاز کے واقعہ نے اسے کچھ اور سنجیدہ اور خاموش بنا رکھا تھا۔ اب بھی ٹھنڈی کے پاس گم صم بیٹھی بے معنی انداز میں ماں اور خالہ کو دیکھ رہی تھی۔ اور جانے کن خیالوں میں گم تھی کہ دفعتہً اسے صنوبر نے اشارہ سے بلایا۔ بے خیالی میں اٹھ کر وہ اس کے پاس چلی گئی۔

"کیا ہے؟" چڑچڑے پن سے اس نے پوچھا۔

"یہ خط آپ کو ایاز میاں نے دیا ہے" زبردستی اس کے ہاتھ میں پرزہ تھما کر وہ فوراً وہاں سے چل دی۔ صنوبیہ نے برا سا منہ بنا کر پرزے کو کھول کر پڑھا۔ اور پھر کاغذ کے پرزے اڑاتی ہوئی بڑبڑائی "کیوں ملنا چاہتے ہیں اب کیا رہ گیا ہے!۔ اپنی بے عزتی تو کر ڈالی۔ خیر سنتی تو ہوں کون سے موتی برسانے والے ہیں۔" لباس ٹھیک کرتی اور [illegible] کرتی وہ باغ کی راہ پر

دی ۔ ایاز سے ملنا کوئی معمولی بات نہ تھی ۔ بہت دنوں سے ان میں بے تکلفی ختم ہو چکی تھی ۔ لیکن دل کی لگی کوئی نہ کوئی تاویل کمزور رہی سہی ، گھڑ لیتی ہے! اس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ سوچ رہی تھی ۔ کیا کہے گا نہ وہ ۔ اس نے چوری نہیں کی ۔ وہ بے قصور ہے ۔ مگر اس سے کہہ کے کیا فائدہ ۔! باغ میں سرِ شام کا سرمئی دھندلکا چھا چکا تھا ۔ اور درختوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں ۔ — فضا اتنی اداس تھی کہ دل خواہ مخواہ بیٹھا جا رہا تھا! مرتی ہوئی روشنی نے ماحول کو زیادہ افسردہ بنا رکھا تھا! وہ خشک پتوں کو قدموں تلے روندتی آخر اس کے دروازے تک آ ہی گئی ۔ اور دروازے پر ایاز اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا ۔ یک بیک اس کے دل نے ایک مسرت بھری قلابازی کھائی ۔ گال دہک اٹھے اور جسم کپکپانے لگا! ۔

کیوں آئی ہیں صنوبیہ بی بی ۔ اب وہ اس سے سوٹ کیس چھین کر اندر پھینک دیں گی اور کہیں گی پاگل ہو گئے ہو کیا ۔ اتنی اتنی سی بات پر کوئی گھر چھوڑ کے بھاگے تو بس ہو چکی زندگی ۔ اور پھر ۔ پھر ۔

وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی ۔ اور دھندلی روشنی میں اسے تکنے لگی ۔ اسے وہ ایک نیا آدمی لگ رہا ۔ بالوں کا جھنڈ بکھیرے ہوئے ۔ ناصاف لباس اور گھنی گھنی مونچھوں تلے آپس میں پیوست ہونٹ ۔ جیسے کہنے کے لیے اس کے پاس بھی کچھ نہ تھا وہ بھی امید و بیم کی عجیب سی اور درخ نرسا اور جانگسل کشمکش میں اسے تکے جا رہا تھا ۔ بالآخر صنوبیہ گرم نگاہی کی تاب نہ لا سکی اس نے پلکیں جھکا لیں اور جب وہ بولی ہے تو اس کی آواز کھوکھلی اور کسی خاص جذبے سے عاری تھی ۔

" تمہیں صنوبر پر بہت زیادہ اعتماد ہو گیا ہے ۔ تم اسے انعام و اکرام سے

سرفراز فرماتے ہو۔ تمھیں وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ کیونکہ وہ اسی معیار کی ہے جس معیار و مرتبہ کے تم خود ہو۔ مگر سن لو ایاز کہ وہ میری ملازمہ ہے۔ میں اس کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتی۔ اسے اتنا بھی قابلِ اعتبار نہیں سمجھتی کہ اس کے ذریعہ کسی طرح کا نامہ و پیام کروں۔ سمجھے۔ بتاؤ اس ذلیل کے ہاتھ تم نے مجھے خط کیوں بھجوایا تھا کیا کہنا چاہتے ہو؟"

حیرت و خجالت کے سنگم پر دم بخود وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔

"کہونا۔ اب چپ کیوں ہو؟!"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں" بالآخر ایاز نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا "یا تو میں پھر کوئی جاگنے کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ انہی منحوس خوابوں نے مجھے ان حالوں کو پہنچا دیا ہے۔ صنوبیہ بی بی۔ آپ کی کون سی ملازمہ ایسی ہے جو مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں حیران ہوں۔ صنوبیہ بی بی۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے کوئی خط کسی کے ذریعہ آپ کو نہیں بھجوایا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میری تقدیر کیوں میری دشمن ہو رہی ہے۔ آپ کی نگاہیں کیوں بدل گئی ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا!"

"ایاز! جھوٹ ایسا بولو جو کسی کی حلق سے اتر سکے" صنوبیہ کے لہجے میں تضحیک تھی۔ "تعجب ہے کہ تم اتنی دھاندلی کر رہے ہو کہ مجھے منھ در منھ جھٹلا رہے ہو۔ ارے! کیا میں آنکھوں کو بھی جھٹلا سکتی ہوں۔ جو کچھ میں نے کل دیکھا تھا۔ وہ بڑا شرمناک منظر تھا۔ تمھیں وہ کمینی لڑکی اتنی پسند آئی کہ تم نے ابا جی کی امانت میں خیانت کی۔ ایاز یہ سب کچھ بہت برا ہوا ہے۔ میں تمھیں ایک بے حد نیک، شریف اور ایماندار آدمی سمجھتی تھی۔ ایاز کیا تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ میں کتنی شرمندہ ہوئی تھی جب تمھارے اسی ٹرنک سے روپے برس گئے تھے۔!

"آپ کچھ بھی سوچ لیجئے۔ جو جی چاہے کہہ لیجئے۔ لیکن جب میں نے امانت میں خیانت نہیں کی۔ میں نے آپ کی کسی ملازمہ پر بری نظر نہیں ڈالی۔ آپ کو خط لکھ کر یہاں تک نہیں بلایا تو میں نادم و شرمندہ کبھی نہیں ہوں۔ یہ جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں صنوبر بی بی۔ وہ سب میرے لیے ایک اچنبھے کی بات ہے۔ جو کچھ بھی آپ کی زبان سے آج تک نہیں سنا۔ وہ اب سن رہا ہوں اور حیران ہوں۔ آپ کو میرے خلاف کس نے بہکایا ہے۔ کس نے آپ کے خیالات خراب کر دیے ہیں۔ ورنہ آپ۔ آپ تو سب سے زیادہ مجھ پر مہربان تھیں۔ آپ کی اتنی عنایات و نوازشیں میرے حال پر رہی ہیں کہ میں ان کا شمار کرنے سے قاصر ہوں۔ دراصل مجھے زندہ ہی رکھا ہے آپ کے مہر و خلوص نے۔ اور ابھی کسی وجہ سے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ زندگی مجھ سے رخصت ہو رہی ہو! آپ کہیں؟"

"تم اب بھی پشیمان و نادم نہیں ہو۔ ایاز۔؟" صنوبر حیرت کی زیادتی کے مارے پاگل تھی اور سوچ رہی تھی کہ کہیں ایاز ہی تو پاگل نہیں ہو گیا۔ اس کے سارے جرائم اور گناہ اس پر سورج کی طرح روشن تھے۔ صنوبر اس کے کمرے سے اپنا دوپٹہ چھوڑ کر سب کے سامنے بھاگی تھی اور چوری کیے ہوئے نوٹ سب کے سامنے اسکے ٹرنک سے نکلے تھے اور پھر بھی یہ آدمی اتنی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ اپنے افعال سے مسلسل انکار کیے جا رہا تھا۔ ڈھٹائی کی انتہا تھی وہ صنوبر کی نظروں سے گرا جا رہا تھا۔ اب اس سے کسی قسم کی ہمدردی اسے نہ رہی تھی۔ چوری اس نے معاف کر دی تھی۔ لیکن اس کا گناہ۔ وہ صنوبر کے نزدیک قابل معافی نہ تھا۔ وہ اسے بڑی حقارت اور تنفر سے دیکھ رہی تھی

انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ کیا وہ اتنا ہی غیرت و شرم سے عاری ہے کہ ندامت و خجالت کا ذرہ بھر اثر اس پر نہیں ہے؟۔ وہ جانے کے لیے مڑی اور سرد لہجے میں بولی۔

"تم نے کہا نہیں کہ تم نے مجھے خط لکھ کر کیوں بلایا تھا۔ کیا یہ حرکت قابل اعتراض نہیں تھی؟ اور پھر صنوبر کے ذریعہ۔ ایاز۔ کہیں تم پاگل تو نہیں ہو رہے ہو؟"

"اگر آپ اسی طرح متواتر مجھ پر بے سر پیر کے الزامات لگاتی رہیں تو پاگل ہو جاؤں گا:" اس نے ان نگاہوں سے صنوبیہ کو دیکھا جیسے خود اسی کو صنوبیہ کے حواسوں پر شک ہو رہا تھا۔ پھر بولا: "میں یہیں کھڑا ہوں۔ بلا لیجئے صنوبر کو اور میرے سامنے پوچھئے کہ میں نے اسے کب کوئی خط دیا تھا۔ اور وہ خط بھی مجھے دکھائیے۔ کیا لکھا تھا اس میں میں نے:" وہ اسے تکتا رہا۔ اب مکمل تاریکی تھی اور سفید لباس میں ملبوس صنوبیہ اس اندھیرے میں کھڑی کوئی سمادی ہستی لگ رہی تھی۔ اندھیرے کی چادر میں اجالے کا پیوند سا!

"مجھے کم رتبہ نوکروں کو منہ لگانا پسند نہیں ہے:" وہ بولی: "اور ذرا رکی پھر بولی" "اگر اس نے تمہارے سامنے کوئی بات ایسی ویسی کہہ دی تو پھر۔ شاید تمہاری آبرو تو نہ جائے۔ مگر میں شرم کے مارے گڑ جاؤں۔ اس لیے جو ہوا وہ ہو چکا۔ کسی سے بھی پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ایاز جبکہ ایک بیہودہ ڈرامہ میری نظروں کے سامنے ہوا تھا۔!"۔

"آپ کا کیا مطلب ہے۔ یہ آپ کہہ کیا رہی ہیں:" وہ کہتا رہ گیا اور صنوبیہ پلٹ کر چلی گئی!۔

اس نے ٹرنک نیچے رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبانے

لگا۔ اب بھی اسے گمان تھا کہ شاید وہ کابوس کا مریض ہو گیا تھا۔ ورنہ ایک ناقابلِ فہم بات کیونکر ہو جاتی!۔ شاید وہ نیند میں چلتا ہے۔ وہ تو بینک سے واپسی پر حکیم صاحب کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ پھر سوتے ہی میں اٹھا تھا اور رشید صاحب کی شیروانی کی جیب سے روپیے نکال کر اپنے ٹرنک میں رکھے تھے اور شاید پھر واپس آ کر سو گیا تھا۔ شاید۔ شاید۔

اور پھر اس کے دماغ میں کھنکھجورے رینگنے لگے۔ ایک خوفناک شبہ نے اسے پسینہ پسینہ کر دیا۔ شاید نیند ہی کی حالت میں اس نے صنوبر کے ساتھ کوئی زیادتی کر دی ہو۔ جس کا حوالہ بار بار صنوبیہ دے رہی تھی۔ ورنہ اسے تو یاد ہی نہیں کہ کون سا بیہودہ اور شرمناک فعل اس سے سرزد ہوا تھا۔ شاید نیند ہی کی جھونک میں اس نے کوئی خط صنوبیہ کو لکھ دیا ہو۔ مگر۔ وہ سویا کب تھا۔ اس کی تو پلک سے پلک نہیں لگی تھی۔ وہ تو رنج و غم کے مارے ساری رات جاگتا رہا تھا۔ دن بھر وہ باغ کی ٹوٹی دیوار کے سائے تلے ٹہلتا اور پہروں میں ذرہ بکرتا رہا تھا۔ پھر ایسی غافل نیند کا حملہ اس پر کب ہوا تھا کہ وہ یوں پاگل ہو گیا۔ صنوبیہ ہرگز جھوٹ نہیں بول سکتی۔ وہ ایسی نہیں۔ تو پھر۔

اس نے سوچا کہ ملازمہ کو طلب کرے اور اس سے پوچھے کہ اس نے اسے خط کب دیا تھا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ جب کابوس کی بیماری ہی کا معاملہ ٹھہرا تو پھر ملازمہ بھی اقرار کرے گی اس نے صنوبیہ کو خط دیا تھا۔ تب کیا ہو گا؟

وہ پاگلوں کی طرح اندھا دھند سوچتا رہا۔ مگر سمجھ میں نہ آیا کہ اچانک اور دفعتہً وہ نیند میں چلنے کا بیمار کیسے اور کیونکر بن گیا تھا!؟۔

اناروں کے جھنڈ کے پاس جہاں کسی طرح کی روشنی کا گزر نہ تھا۔ بیگم صاحبہ، باجرہ، عمرانہ اور شازیہ وغیرہ کھڑی تھیں۔ انھوں نے ایاز و صنوبیہ کے

سارے مکالمے بھی سنے تھے۔ اور ان کی دیدہ دلیری پر آنکھیں بھی پھاڑ دی تھیں۔۔
یہ بھی ان کے علم میں آیا تھا کہ ایاز کوئی خط لکھ کر صنوبیہ کو بلایا تھا۔
اب۔۔ حقیقت سے قطعی لاعلم اور بے خبر تھیں۔ کیونکہ کچھ دیر قبل جب
صنوبیہ ایاز سے ملنے چلی گئی تھی تب جبیر نے بڑی برہمی کے عالم میں ماں
اور نانی کے سامنے صنوبیہ کی بری حرکت کی اطلاع دی تھی۔ صنوبیہ تنہائی اور
تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ایاز کے بلاوے پر اس سے ملنے گئی تھی۔ مارے طیش
کے جبیر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ دکھا رہا تو تھا۔
ارقم نے خط کے پرزے اکٹھا کر کے جوڑ لیے تھے۔ ثبوت کے طور پر وہ بیگم صاحبہ
کی خدمت میں پیش کر دیے گئے!۔ اور تصویر غم بن کر رہ گیا۔
بیگم کا یہ حال تھا جیسے انہی سے کوئی ناقابل تدارک جرم سرزد ہو گیا ہو
ہاجرہ نے بھی سینہ تھام لیا۔ مردہ آواز میں بولی تھیں۔
"چلیے اسے لے آئیں۔ یہ ایسی دیدہ دلیر اور خود سر کیسے ہو گئی۔ نہ اپنی
عزت و آبرو کا پاس کرتی ہے نہ بڑوں کا ادب لحاظ اسے رہ گیا ہے۔ ابی
جی کو معلوم ہو گا تو کیا کہیں گے وہ۔۔!"
معلوم ہونے بھی نہ دینا۔ آپی آپ ان کی طبیعت خراب ہے: بیگم نے
کہا۔ اور پھر تینوں معتبر خواتین ایک اہم مہم سر کرنے چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے
بعد جبیر و ارقم ہاتھ ملا کر مسکرائے تھے
دفعتہً بیگم صاحبہ تاریکی سے نکل کر روشنی کے انعکاس میں آ گئیں! ان کے
پیچھے ہاجرہ اور عمرانہ اور چھوٹی بھابی تھیں!۔
ایاز۔۔!" بیگم صاحبہ نے کہا۔
"جی۔۔!" سیدھے اور معصوم لہجے میں اس نے جواب دیا۔

بیٹے دیکھو: انھوں نے کہا: ہم نے تمھیں اپنے بچے کی طرح پالا پوسا ہے ہم تمھاری بھلائی اور خیر خواہی چاہتے رہے ہیں! اب ماشاء اللہ تم بڑے ہو گئے ہو اور اب تم بھی اپنا اور ہمارا بھلا برا سوچتے ہو گے۔ تم کچھ اور ہو بیٹے مجھے یہ کہتے ہوئے بہت برا لگ رہا ہے بیٹا کہ تم کچھ دنوں کے لیے اپنا بندوبست کہیں اور کر لو۔ میاں یہ اچھی بات نہیں ہے نا کہ تم نے خط لکھ کر لڑکی کو یہاں بلایا اور وہ آ بھی گئی۔ وہ نا سمجھ ہے مگر تم تو نا سمجھ نہیں ہو۔ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہو جائے تو وہ بدنام ہو گی۔ تم مرد ہو تمھارا کچھ نہ بگڑے گا۔ سو بیٹا میری نصیحت مان لو۔ میں تمھارا اور پیسہ تمھیں دے دیتی ہوں۔ وہ لے لو اور سال چھ مہینے کے لیے کسی دوست کے ہاں رہ آؤ۔ پھر لڑکی کی شادی ہو جائے گی۔ تب پھر چاہے آنا۔ میں تمھاری اور اس کی بھلائی کے لیے کہہ رہی ہوں!"

ایاز کا چہرہ یوں سنت گیا جیسے ساری رگیں سکڑ گئی ہوں۔ اس کا دل اپنی دھڑکنیں بھولنے لگا۔ ویسے تو وہ خود ہی اس جگہ کو خیرباد کہہ رہا تھا مگر اسے چاہنے والی اماں کے منھ سے یہ سب سننے کی توقع نہ تھی!۔

اس نے عجیب سے لہجے میں اور بے ربط جملوں میں کہا۔

"اماں۔ میں نیند میں چلنے کا بیمار ہو گیا ہوں۔ کیونکہ مجھے کچھ یاد نہیں آتا میں نے کون کون سے جرم اور گناہ کیے ہیں۔ میں اور بھی کچھ کر بیٹھوں گا۔ اس لیے میں۔ خود ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔! اماں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے ہوش کے عالم میں خط لکھ کر صنوبیہ بی بی کو نہیں بلایا۔ اماں۔ میں۔ سچ بول رہا ہوں۔ آہ۔ اماں۔ میں آپ سب کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ باہر میرا اپنا کوئی نہیں ہے۔ مجھے آپ سب یاد آئیں گے۔ تب میرا کیا حال ہوگا۔ مگر اماں۔ آپ کے کسی نقصان سے یہ اچھا ہے کہ میں چلا جاؤں۔

آپ پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ! اچھا۔ اماں۔ خدا حافظ۔
اور سب کے لبوں پر تالے لگ گئے !۔

وہ خوبصورت ہنستا ہوا روتا ہوا اتھکا سا بے سر و سامان بے یار و مددگار بچہ ایک دن ان کے ہاں آیا تھا۔ آج چلا گیا تھا۔ دس بارہ سال بعد۔ یہ درمیانی مدت کہاں گئی تھی۔ جیسے وہ کل آیا اور آج چلا گیا !۔

اندھیرے نے اسے نگل لیا۔

اماں کی حلق آنسوؤں نے بند کر دی۔

ہاجرہ نے مدھم لہجے میں کہا : تصور صنوبیہ کا بھی ہے۔ لڑکی اتنی ضدی کا خودسر اور خودرائے ہے کہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھتی ہے نہ کسی کی سنتی تھی وہ مجھ سے اگر کہہ دیتی کہ ایاز نے اسے بلایا ہے تو میں اسے منع کر دیتی۔ ایاز کو بھی سمجھاتی۔۔ بیٹا۔ یہ کام اچھا نہیں !۔

بہت پہلے ابی جی نے اسی برائی کی طرف اشارہ کیا تھا تبھی ہم کو خیال نہ آیا : نازیہ نے کہا : اسے اپنے پاس نہ رکھتے۔ مگر اب یہ سب کچھ کہہ کے کیا فائدہ۔ وہ تو گیا !۔

نیند میں چلنے کا کیا قصہ ہے امی۔ ؟ : عمرانہ نے پوچھا۔

بیوی میرا دل تابو میں نہیں۔ کلیجہ بیٹھا جاتا ہے۔ " ان "۔ سے کیا کہوں گی ارے وہ نامراد تو اپنا روپیہ بھی چھوڑ گیا : اماں نے کہا اور رونے لگیں۔ !!

شکیب نے ایاز کی ساری داستان سن کر برا سا منہ بنایا۔ وہ بولا : سچ کہتا

ہوں کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں تم سے لاکھ درجہ حوصلہ مند، بہادر اور ہمت والی ہیں۔ کسی مصیبت میں یوں کندھے نہیں ڈال دیتیں۔ کسی پریشانی میں نہیں گھبراتیں۔ ان کا مقابلہ کرتی ہیں اور بالآخر فتحیاب ہوتی ہیں۔ تم مگر بیچے پلپلے آدمی ہو۔ کسی بات کی طاقت اور ہمت تم میں نہیں ہے۔ تم گدھے آنسو بہا رہے ہو۔ ارے لعنت ہے۔ میاں۔ بھول جاؤ اپنی زندگی کا وہ عبوری دور۔ زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ سنو احمق۔ گیارہ بجے سے امتحان شروع ہوگا۔ اب بھی سویرا ہے۔ چلو اٹھو۔ منھ ہاتھ دھو۔ کپڑے بدلو۔ میں کھانا منگواتا ہوں۔ اطمینان سے کھا پی کر چلیں گے۔ دیکھو۔ ایاز احمد۔ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو میں تمھیں یہیں قتل کردوں گا!"

شکیب کی لمبی چوڑی تقریر کے درمیان میں وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا: "کچھ نہیں۔ اب میں ایک دوسری مہم شروع کردوں گا۔ میں اب جا رہا ہوں۔ اپنے پرانے محلے میں جاکر میں اپنے پڑوسی نانا جعفر علی سے ملتا ہوں اور ان سے پوچھتا ہوں کہ آخر خالہ میرن گئی کہاں ہیں۔ پھر ان سے جاکر اپنے والدین کا پتہ چلاؤں گا۔ امتحان وغیرہ گیا جہنم میں۔ میرے دل میں تو آگ سلگ رہی ہے۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ مجھے۔ اس وقت میرا دماغ گھوم رہا ہے۔ میں پرچے میں لکھوں گا کیا۔ خاک؟ پتھر؟"

"خاک پتھر اینٹ گارا۔ کچھ بھی لکھ دو۔ مگر لکھو۔" شکیب نے کہا: "میں کبھی نہ مانوں گا۔ تم امتحان نہ دوگے میں بھی نہ دوں گا۔ اتنا سوچ لو۔ میرے مستقبل کا خون بھی تمھاری گردن پر ہوگا!"

آخر مجھی کو مجھ سے اتنی محبت کیوں پھوٹ پڑی ہے۔ جب اپنے پالنے والوں نے مجھے نکال باہر کیا ہے۔ وہ دبی آواز میں گرجا۔

میاں۔ عشق اول در دل معشوق پیدا می شود۔ اب تم مزید بکواس مت کرو۔ اٹھو۔" شکیب نے کہا پھر زنانے دروازے کی طرف منہ کر کے چلایا: "اماں ناشتہ اگر تیار ہو گیا ہو تو بھجوا دیجئے۔!"

"میں نانا جعفر علی سے ملنے جا رہا ہوں!" وہ ضد پائے ہوئے بچے کی طرح بولا۔

"میں بھی ان سے ملوں گا۔ نام ہی سُن کر نانا جعفر علی سے ایسی محبت لگ رہی ہے۔ پرچہ دے کر امتحان ہال سے نانا ہی سے ملنے چلیں گے۔ بشرطیکہ پندرہ برسوں میں وہ اللہ میاں سے ملنے نہ چلے گئے ہوں۔ تب تو ایاز بھائی مجبوری ہو گی۔ فی الحال میرا ارادہ اللہ میاں سے ملاقات کا نہیں ہر مطلب یہ کہ نے تابِ وصل مرا دم نے طاقت جدائی۔!

"اب تم فارسی میں بور کرو گے کیا؟" پھیکی مزہ سی مسکراہٹ ایاز کے لبوں پر رینگی۔

"تم یہ دیکھو کہ میں کتنی بے شمار زبانوں پر عبور رکھتا ہوں" فخر سے گردن اٹھا کر ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا شکیب بولا: "مثلاً انگریزی، اردو، فارسی"

"واقعی بے گنتی زبانیں ہیں" ایاز نے کہا۔

"تو پھر چلو۔ لباس تبدیل کر لو، ساڑھے نو بج چکے ہیں" شکیب نے پھر اپنے اصلی موضوع پر لا کھڑا کیا: "میں تو تیار ہوں۔ اب تم بھی بن ٹھن کے تیار ہو جاؤ۔!"

"دل نہیں چاہ رہا شکیب!"

"بہت سی باتیں نہ چاہنے پر بھی کرنی پڑتی ہیں میرے بھائی" شکیب نے شعر یا مصرعہ پڑھے بغیر سنجیدگی سے کہا: "اور پھر اس ضروری کام میں دل کے چاہنے نہ چاہنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو کھانے پینے پہننے اوڑھنے کی طرح ضروری ہے۔ تمھیں اسی ظالم خود غرض دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ تم جیسے طبیعے کے آدمی

ہو۔ اس طبقے میں سانس لینے کے لیے کوئی عمدہ سند، کوئی شریفانہ پیشہ اور متوسط درجہ کا طرزِ حیات ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم جیسی صورت شکل، اچھے ڈیل ڈول اور پڑھے لکھے لوگ قلی گیری نہیں کر سکتے، ٹھیلے نہیں ڈھکیل سکتے، رکشا نہیں چلا سکتے۔ اور تمھیں جینا تو بہرحال ہے۔ اس کے لیے روٹی اور نمک بھی ضروری ہے۔ روٹی اور نمک کے پیدا کرنے کے لیے بھی پیسے چاہییں۔ وہ تمھیں کوئی اللہ کے نام پر نہیں دے دیگا۔ تمھیں محنت کرنی پڑے گی۔ تمھاری محنت یہی ہے کہ تعلیم پوری کر دا اور پھر ملازمت۔! دیکھو کیسی عمدہ اور معقول تقریر میں نے کر دی۔ ڈائس پر ہوتا تو تالیاں بجتیں۔ ونس مور کے نعرے لگتے۔ میرے گلے میں ہار ڈالے جاتے۔ یہاں کچھ نہیں۔ داد اور تعریف بھی نہیں۔ تم منہ کھولے بیٹھے ہو۔ پچ ہے۔ ایک مجھ جیسے عالم فاضل انسان کو تم ایسے ناقدروں کے سامنے دانائی اور حکمت کے موتی لٹانے ہی نہ چاہییں۔ ہنھ!۔ ارے ہم جیسوں کی صحبت غنیمت ہے میاں۔ اب بھی سویرا ہے۔ کچھ سیکھ لو۔ وہ جو کہا ہے۔ علامہ اقبال نے کہ ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
کرتے کسی کو سنئے گا تو پہروں دل سر کو دھنیے گا

شعر علامہ اقبال کا ہو چاہے میر کا: ایاز ہنسنے لگا۔ "مگر تعجب ہے کہ تم نے عمر بھر میں ایک صحیح شعر پورا پڑھ کیسے دیا۔؟

بیٹا تجھے کیا ہو جھے" شکیب نے سینہ پھلایا: "مجذوبوں کی ہر حرکت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی مصلحت پوشیدہ رکھی ہے۔! یہ تم جیسے کوتاہ بین آگی الو نرے بھلا کیا سمجھیں گے۔"

"بڑے آئے کہیں کے گدھے مجذوب۔ مسخرے۔" ایاز بولا۔

ملازم ناشتہ لے آیا!

ایاز گھر سے نکلنے کے بعد شکیب ہی کے گھر آیا تھا۔ اور شکیب نے بڑی فراخدلی اور محبت سے اسے اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔ کالج کی ابتدائی کلاسوں ہی سے دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی اس کے خاندان والے بھی ایاز کو جانتے اور پسند کرتے تھے۔ شکیب کے والد اور بڑے بھائی بھی بہت مخلص اور دریا دل لوگ تھے۔ انھیں ایاز کے ماضی سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ وہ لوگ بڑی اپنائیت سے ملتے ملاتے تھے۔ شکیب کی امی بھی اسے چاہتی تھیں۔ چونکہ شکیب انھیں بہت پیارا تھا اس لیے اس کے دوست بھی انھیں عزیز تھے۔ شکیب کی چھوٹی بہن حوری نے اس کے لیے باہر کا کمرہ درست کر دیا تھا۔ ان سب کی عنایات کے بوجھ سے وہ پگھلا جا رہا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ یہاں سے بھی بھاگ جائے مگر سب کی محبت و خلوص کی زنجیروں کو توڑ کر بھاگنا ممکن نظر نہ آ رہا تھا!

کھانے کے دوران میں امی بھی آ کر بیٹھ گئیں۔ ان سے سارا قصہ شکیب نے کہہ دیا تھا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں ایاز کو مشورے دیے۔ نصیحتیں کیں اور پھر ایک نئی بات کہہ دی۔ جس تک ان لوگوں کا دماغ پہونچا ہی نہ تھا۔ بولیں۔

”تم کو ان لوگوں نے پاگل بنایا ہے۔ نہ تم بیمار ہو نہ نیند میں چلتے ہو کسی نے تمھیں وہاں سے نکالنے کے لیے گہری چال چلی ہے۔ بڑی دور سے آئے ہیں مطلب یہ کہ بات بنی بھی جائے بات بگڑے بھی! نہیں۔ وہ لڑکی۔ کیا نام صنوبیہ۔ اس کا التفات اور توجہ کسی سے دیکھا نہیں گیا ہے۔ بس۔ سوچا ہوگا کہ راہ کا روڑہ ہٹا دیا جائے! کوئی چال چلی ہے اور اس

طرح تم کو گھر بدر کیا ہے !"

"واقعی ...!" شکیب نے بڑی زور سے آنکھیں نکالیں۔

"مگر وہ روپئے جو میرے صندوق سے نکلے تھے؟" حیران اور سراسیمہ ہو کر ایاز بولا۔

"تم تو سو گئے تھے۔ سب لوگ گئے ہوئے تھے کسی کے مرنے میں۔ سید صاحب کی جیب سے رقم نکال کر تمھارے صندوق میں رکھ دینا کون سی بڑی بات تھی؟" امی نے کہا۔

"اور ۔ وہ ۔ وہ خط جو میں نے بے خبری میں صنوبیہ کو لکھ دیا تھا" مزید حیرت کے سمندر میں ڈوب کر ایاز بولا "اس کا کیا معمہ ہے۔ صنوبیہ بہت نستعلیق لڑکی ہے۔ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح چھچھوری لڑکی نہیں ہے۔ وہ ایسا رکیک جھوٹ بھی نہیں بول سکتی۔ اور امی، یہ بھی تو سوچیے کہ میں ان کے گھر ملازم کی طرح رہا ہوں انھوں نے مجھے برابری کا درجہ دیا۔ مہربانی ان کی۔ مطلب یہ کہ مجھ سے وہ کیوں اس طرح خائف اور مرعوب تھے کہ اتنا گہرا پلان بناتے۔ مجھے نکالنا ہوتا۔ صاف صاف کہہ دیتے کہ اب اس قابل ہو چکے ہو کہ اپنا بار آپ اٹھا سکو۔ لہذا چلے جاؤ۔ امی۔ حلق سے اترتی نہیں یہ بات !"

"بات بہرحال یہی ہے۔ جو امی نے کہی ہے۔ اب اس کی تشریح اور توجیہ ہم کریں گے۔ تم فی الحال اپنی خالی کھوپڑی مزید خالی نہ کرو"! شکیب نے کہا۔ اور کھانا ختم کرکے ماں سے بولا" اچھا امی۔ اب ہم ڈیوٹی پر جاتے ہیں دعا کیجیے گا کہ ..."

"بیٹے جاؤ۔ الحمد اللہ سے جاؤ" امی نے ... جواب دیا۔

میری تمام دعائیں تم لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اللہ تمھیں کامیاب کرے۔ بڑے مرتبے عطا کرے۔"

"سچ مچ امی آپ بہت اچھی ہیں۔" شکیب نے کہا اور شعر عرض کیا۔ سه

جان تم پر نثار کرتا ہوں۔۔ اور ورزش کی صدا کیا ہے۔

"پاگل تو نہیں ہوا ہے لڑکے۔" امی نے ڈانٹا۔ "کل باپ کے سامنے اوٹ پٹانگ شعر بک دیا تھا۔ میری طرف دیکھ کر خاموش رہ گئے تھے۔ ایک دن ان کے ہاتھ سے مار ضرور کھائے گا!۔ چھوڑ اپنی یہ عادت موٹی بکواس۔"

مارے باندھے ایاز امتحان ہال میں پہونچا تھا۔ دل کہیں تھا۔ دماغ کہیں، اس نے جوابی بیاض میں کیا لکھا تھا اسے خود معلوم نہ تھا۔ امی کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ آخر کیا تھا وہ سب!۔ یکبارگی اتنے برسوں بعد اس سے کس نے دشمنی نکالی تھی۔ کیوں نکالی تھی۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔؟ وہ جوابی بیاض پر قلم گھستا رہا۔ اور دماغ کہیں اور دوڑاتے پھرتا رہا تھا!۔ مگر وہ کوئی معقول جواز نہ سوچ سکا!۔

امتحان کے بعد دونوں کینٹین میں آئے۔ اور معمول سے ناشتے کے بعد ایاز نے شکیب سے شام تک کو اجازت چاہی۔

"کون سے صحرا میں نوردی کرنے جا رہے ہو" شکیب نے پوچھا۔

"نانا جعفر علی کا پتہ تلاش کرنے۔ کیونکہ میں دنیا کا اعلا ترین احمق ہوں ان کا پتہ لینے میں اپنا پچھلا گھر بھی بھول گیا ہوں۔" دانت پیس کر ایاز نے کہا۔

"تھا کون سے محلے میں!۔" شکیب چونکہ طوفانی خیالوں میں گھرا ہوا نہ تھا وہ ڈھنگ کی بات سوچ سکتا تھا!

وہاں" کینٹین پر انگلی بجا کے ایاز نے کہا۔ "حسینی علم سے آگے پڑتا بارہ دری

تھی۔ کچھ یاد آتا ہے۔ اتنے سال گزر چکے۔ اب وہاں بھی نجانے کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہوں گی۔

"چلو وہیں چلتے ہیں"۔ شکیب اپنے اسکوٹر کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ "خدا کرے کہ تمھارے جان وجگر نانا جعفر وہاں مل جائیں۔ واہ۔ کیا قافیہ ملا ہے۔ جان وجگر نانا جعفر۔ میں تو کہتا ہوں۔ ایاز میاں۔ میری طرح تم بھی گفتگو میں موزوں اشعار کا استعمال شروع کر دو۔ شعرا اور علماء سے بات چیت کرنے کے قابل ہو جاؤ گے!"

"جی مجھے معاف رکھیے!" ایاز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شعرا اور علماء آپ ہی کی گفتگو سن کر دل میں کہتے ہوں گے۔ کہ نجانے کس خبطی سے پالا پڑا ہے ایک شعر اقبال کا تو دوسرا میر کا۔ ان میں ربط نہیں۔ مصرعوں میں شتر گربگی۔ تم یہ عادت ترک کر دو۔ صبح ہی کو امی نے مارا ہوتا!"

دونوں سے سہ پہر کی گفتگو کرتے بالآخر مطلوبہ جگہ پہونچ ہی گئے۔ شکیب کا حال پتلا تھا ایک تو سخت گرمی۔ دوسرے چمکتی اور لہریں سی لیتی ہوئی تیز دھوپ۔ اور اوپر سے اسے پیاس نے بدحواس کر رکھا تھا۔ تقدیر کی خوبی سے اسے ایک ہوٹل مل گیا۔ اس نے اسکوٹر شیڈ میں رکھ کر ایاز سے کہا۔

"پہلے پانی وانی پی لیں۔ پھر گھاس کے گٹھر میں سوئی ڈھونڈنے نکلیں گے اتنی دیر میں پیارے نانا جعفر امریکا یا لندن نہیں چلے جائیں گے۔ چلو آؤ!"

"عجیب آدمی ہو۔ نانا جعفر میری چڑھ بنالی ہے کیا؟"۔ ایاز اس کے پیچھے لپکتا ہوا بولا۔

اور آدھے گھنٹے بعد جب ایاز باہر نکلا تو اچانک ...

اس کا پرانا محلہ تھا،" فرسودہ افتادہ محلہ۔ جہاں کوئی قابلِ لحاظ تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ وہ پرانا شفاخانہ جہاں اب بھی دروازے پر دھبہ دار گہرا ابیز پردہ جھول رہا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی چہار دیوار جہاں بھینسوں کے بندھنے کا باڑہ تھا۔ اب بھی ٹھنڈے سائبان تلے کئی بھینسیں کھڑی جگالی کر رہی تھیں۔ سامنے لکڑی کی ٹال۔ ایک طرف سڑک کے موڑ پر جالیدار اسکول کی عمارت۔ سب کچھ جیسے کا تیسا تھا۔ گویا کسی مصور نے ادپری دل سے ایک بے ڈھنگی سی تصویر بنائی ہو اور پھر کاہلی کے مارے اس میں قلم لگانا بھی گوارہ نہ کیا ہو۔

شکیب اس کی جذباتیت سے متاثر ہو رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "کیا یہی وہ جگہ ہے ایاز۔ جہاں تمہارا بچپن گزرا تھا!"

"ہاں" اس کی آواز بھی اندھے کنوئیں سے نکلی۔

تو پھر ذہن پر زور دو۔ کہاں تھا خالہ میرن کا گھر۔؟

سب کچھ گڈمڈ ہو رہا ہے" اس نے مدھم لہجے میں جواب دیا: یہ سڑکیں۔ یہ گلیاں۔ یہ کچے پکے مکانات۔ سب کچھ۔ آپس میں مل جل کے مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ کہاں جاؤں۔ کس سے پوچھوں۔!" وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ "تو کچھ کرو جلدی کرو۔ میں جھلس رہا ہوں۔ دیر لگے گی۔ سڑک پر بہہ نکلوں گا" شکیب نے کہا اور پھر دفعتہً ایاز کے دماغ پر چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی ہوا یہ کہ ایک طرف سے ایک کمر خمیدہ بڑے میاں نکلے! سر پہ نماز کی دو انگل کی ٹوپی دیے۔ نیچا سا کرتہ اور اٹنگا تہبند باندھے۔ شاید بیچارے ظہر کی نماز کے لیے مسجد جا رہے تھے کہ شکیب ان کی طرف جھپٹا اور زبردستی سلام کر کے معانقہ کرتا ہوا دانت نکال کر بولا۔

"جعفر نانا کہاں کہاں ڈھونڈا ہے آپ کو۔ واللہ ہے کہ خوب ملے۔ اب رہتے کہاں ہیں آپ۔ نانی تو اچھی ہیں۔ ان سے ملے بھی برسوں ہوگئے۔ نانی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔" اس نے ایک سسکی سی لی۔ ادھر بڑے میاں کوشش کر کے تن کے کھڑے ہو گئے تھے اور بھونچکا سے اسے گھور رہے تھے۔ اس وقت ان دونوں ہی کے چہرے ایسے مضحکہ خیز تھے کہ مارے ہنسی کے ایاز کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

میاں۔" بڑے حضرت کھانس کھنکار کر بولے" میرا نام جعفر نانا نہیں ہے میں تو قربان دین ہوں۔ آپ کون سے جعفر کو پوچھتے ہیں؟"

"کیا یہاں کئی ہیں؟" شکیب نے الٹا سوال کر دیا۔

"ایک تو میرا پوتا ہے۔" وہ خوش ہو کر بولے "دوسرے صاحب میرے پرانے دوست اسی نام کے ہیں۔ وہ"

"جی ہاں۔ وہی وہی۔ وہ کہاں رہتے ہیں؟" شکیب جلدی سے بولا ظاہر تھا کہ ان کی عمر کے دوست وہی ہوں گے جن کی ایاز کو تلاش تھی۔ مگر اب دونوں ہی بوکھلا رہے تھے۔

"جعفر میاں؟" بڑے میاں نے سوچتے ہوئے کہا "ادھر تشریف لے جائیے انگریزی نام کا ایک اسکول ہے۔ وہ دیکھئے "کیری سن" اسکول۔ اس کے پیچھے جو مکان ہے وہی جعفر صاحب کا ہے! اچھا۔ میں چلتا ہوں میاں۔ اذان ہو چکی ہے۔"

"گریسنٹ اسکول" ایاز بڑبڑایا "خدا کی قسم۔ وہی ہے شکیب۔ میں اپنے گھر سے نکل کر اس گلیارے میں آ کھڑا ہوتا تھا اور بچوں کو دیکھا کرتا تھا کہ بستے لیے اسکول جا رہے ہیں۔ بہت تڑپتا تھا کہ میں کم کاش میں بھی اسکول جا سکتا

وہ تو خیر سب کچھ تھا۔ اب آگے بڑھو۔ نانا سے خالہ کا پتہ پوچھیں۔ شکیب نے سنجیدگی سے کہا: اچھے نانا اور اچھی خالہ ہیں کہ نواسوں اور بھانجوں کو اس بڑی اگری میں چکر گھنی بنا رکھا ہے۔ واہ۔ کیا خوب کہا ہے خواجہ میر درد نے ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
تشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

بوسیدہ سے دروازے کھلے تھے۔ ٹاٹ کا پردہ ہوا سے ہل رہا تھا! اور جوکھٹ پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی گرڈی سی کوئی چیز سی رہی تھی! اچانک دو اجنبی نوجوانوں کو دیکھ کر اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ استفسار اس کی آنکھوں میں مچل رہا تھا! انھوں نے اسے سلام کیا! ذرا کھنکھار کر شکیب نے پوچھا "ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا جعفر علی صاحب اسی مکان میں رہتے ہیں!؟" ایاز چپ تھا۔ کیونکہ وہ پچھلی یادوں کے بھنور میں چکرا رہا تھا۔

ہاں: عورت نے جواب دیا: مگر میاں آپ لوگ۔؟

ان سے ہمیں بڑا ضروری کام ہے۔ اگر آپ انھیں اطلاع دے دیں کہ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں، تو ہم آپ کے بڑے شکر گزار ہوں گے!

نام پوچھیں گے۔ کیا بتاؤں۔؟"

شکیب نے ایاز کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی گلا صاف کر کے کہا۔

ان سے یہ کہیے کہ ایاز احمد ان سے ملنا چاہتا ہے!؟

ایاز!؟ عورت چونکی۔ کون ایاز۔ وہ جو میرن آپا کے پاس رہتا تھا۔ کہاں ہے وہ۔ ہائے میں تو سمجھی تھی کہ بچہ مر کھپ کے برابر ہو گیا۔ میرن آپا نے تو بڑے گھر کے بچے کے راز اپنے چھپا لیے اور خود ٹکے سیر ہے کر کے گاؤں بھاگ گئیں۔ ارے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپا تم کاہے کو کسی کے پھٹے میں پاؤں

ڈالتی ہو۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میرن آپا خود ڈر گئی تھیں۔ اُلٹے آنیتیں نہ گلے پڑیں۔ جب تک نجمہ بی بی سسرال سے نہیں آگئی تھیں۔ انھوں نے بڑے مزے میں بچے کو اپنے پاس رکھا تھا پر جیسے ہی نجمہ بی بی اور ان کے میاں بھوپال سے یہاں آگئے۔ میرن آپا کے حواس اُلٹے ہو گئے۔ گاؤں جانے ہی میں بھلائی دیکھی تھی۔ ہاہ۔ ہاہ۔ اب تو بارہ تیرہ برس گزر گئے۔ مگر میاں وہ بچہ۔ ایاز احمد۔ اب کہاں ہے۔ اللہ رکھے۔ بہت بڑا ہو گیا ہو گا۔ وہ میرے شوہر سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔ وہ ہے کہاں؟"

شکیب اور ایاز ہکا بکا سے اس بکواسی بڑھیا کو گھور رہے تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ کون نجمہ بی بی۔ ان کے میاں کون؟۔ بہر حال کامیابی کے کسی حد تک کنارے پر پہونچنے سے دونوں ہی بوکھلا رہے تھے۔ شکیب نے حواس درست کر کے کہا۔

"آپ جعفر صاحب کو بلا دیجئے۔ ان کے سامنے ہم بتا دیں گے کہ ایاز احمد اب کہاں ہے۔ اور کیوں ملنا چاہتا ہے۔"

"میاں کوئی تھانے کچہری کا معاملہ تو نہیں ہے۔" عورت نے ٹٹولنے والی نظروں سے انھیں باری باری گھورا۔

"نہیں خالہ اماں نہیں!" شکیب نے سر ہلایا۔

"اچھا میں انھیں لاتی ہوں۔!" وہ ٹاٹ برابر کر کے اندر غائب ہو گئی۔

"تمھارے تارے زوردار معلوم ہوتے ہیں۔" شکیب نے ذرا احساس سے مغلوب ہو کر ایاز کا ہاتھ دبایا۔ "اب سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ یہی تو کہتے ہیں کہ ہر تخریب میں ایک تعمیر مضمر ہوتی ہے۔ شاید مولانا حالی نے اس مضمون میں کچھ کہا بھی ہے کہ میری تعمیر میں ایک صورت

خرابی کی بھی مضمر ہے۔ کیا ہے وہ مصرعہ۔؟"

ایاز گوناگوں جذبوں اور خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ کیا سچ مچ اس کے والدین کا پتہ چل جائے گا۔ کیا سچ مچ اس کی دربدری میں کوئی اچھائی پنہاں ہے۔؟ وہ شکیب کو کوئی جواب نہ دے سکا کہ ٹاٹ کا پردہ سرکا اور ایک سفید داڑھی والے بڑے میاں نے باہر سر نکالا۔!

"السلام علیکم!" شکیب نے انھیں سلام رسید کردیا۔ ایاز نے بھی مکھی سی اڑا دی۔ "وعلیکم السلام"۔ پگھل کر بڑے میاں نے کہا اور باہر تشریف لائے۔ پھر نہایت نستعلیق لہجے اور ادب آداب الفاظ میں کہنے لگے۔

"فرمایئے صاحبزادے! یہ خادم آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہے۔ آپ نے اس گرم موسم میں بجانے کہاں سے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ کوئی اہم اور ضروری کام ہی احباب کو خادم کے غریب خانہ پر لانے کا باعث بنا ہے۔ اوے میاں۔ کوئی خیال نہ فرمایئے تو اندر تشریف لایئے نا۔ آرام سے بیٹھ کر اطمینان سے ارشاد فرمایئے۔! جو کچھ بھی آپ کو خاکسار سے کہنا ہے۔"

انھوں نے انھیں ایک صاف ستھری نشست میں بیٹھایا اور خود سامنے ٹک گئے!۔ یہاں ایک گوشے میں برقی پنکھا بھی رکھا تھا۔ جعفر صاحب نے اسے آن کردیا اور وہ بے چارہ جو غالباً پچھلی گرمیوں کو بھگتا چکا تھا۔ گھرر گھرر کرکے ہوا پھینکنے لگا۔!

"کچھ ٹھنڈا مشروب۔!" وہ پوچھ رہے تھے۔

"جی نہیں۔ شکریہ" شکیب نے ان کی طرزِ گفتگو سے مرعوب ہو کر کہا۔

"پھر۔ فرمایئے!۔"

"ہم آپ سے یہ دریافت کرنے حاضر ہوئے تھے کہ اگر آپ۔ مہرن خالہ نامی کسی محترمہ کو جانتے ہیں تو براہ کرم ۔۔!" ایاز بولنے لگا۔

جعفر نانا نے بات اُچک لی "میری بہن ۔۔! میاں صاحبزادے وہ تو عاجز کی ہمسائی ہی تھیں۔ ان سے شناسائی کیا۔ یہ کہیے کہ عزیزداری ہی تھی ان کی بھانجی میرے بچے کی دُلہن ۔۔!"

انتقاماً شکیب نے ان کی بات کاٹ دی "تو وہ محترمہ کہاں ہیں؟ ہم نے سُنا تھا کہ وہ کہیں گاؤں چلی گئی ہیں۔ ان سے بڑا ضروری کام آپڑا ہے۔ ان کے گاؤں کا نام بتا دیجیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ زندہ تو ہوں گی نا؟"

"الحمد اللہ" انھوں نے قرات سے کہا "وہ بجوپ نگر سے آگے کسی قصبہ" "گدوال ۔۔!" شکیب بول پڑا۔

"جی بس وہیں" وہ مسکرائے "وہاں ان کے بیٹوں کی آراضی ہے۔ کھیت ہے۔ مزے میں ہیں۔ تیرہ سال ہو چکے انھیں یہاں سے گئے ہوئے۔ مگر واللہ۔ کیا مجال کہ ایک سطر اپنی یا کسی کی خیریت انھوں نے لکھوائی ہو۔ زمانے سے اخلاص و اخلاق اڑ ہی گیا صاحب! مگر میں یہ پوچھنا بھول گیا کہ آپ حضرات کو ان سے کیا کام آپڑا ہے۔"

"آپ تو جانتے ہوں گے کہ ان کے ہاں ایک لڑکا ایاز نامی رہتا تھا اس کے بارے میں پوچھنا تھا" دھڑکتے دل سے ایاز نے کہا "وہ کس کا لڑکا تھا۔ ان کے پاس کہاں سے آیا تھا۔ اور اس بچے کے ماں باپ کہاں تھے۔ اب یہ سب کچھ تو وہی بتا سکتی ہیں۔!"

"کہاں ہے وہ لڑکا" بڑے میاں نے اشتیاق سے ٹوٹے پھوٹے دانت نکال کر پوچھا "اب تو ماشا اللہ جوان ہو چکا ہوگا۔

ان کی بات اٹھا کر ایاز نے کہا: "اگر کچھ آپ کو معلوم ہو تو براہ کرم بتائیے وہ لڑکا میرن خالہ کے پاس کہاں سے آیا تھا۔ کن حالات میں آیا تھا۔ دراصل بات یہ ہے جناب کہ ایاز احمد کا پیغام ایک جگہ گیا ہے۔ لڑکی والوں نے اس کا حسب نسب دریافت کیا ہے۔ باپ کا نام پوچھا ہے ظاہر ہے کہ کسی قسم کی پوچھ گچھ کے بغیر کوئی اسے اپنی لڑکی کیسے دے دے گا۔ وہ چونکہ پریشان ہے۔ اس لیے اس کی پریشانی ہم سے دیکھی نہ گئی۔ اس کے دوست ہیں۔ اور اسی کی نشاندہی پر آپ کے پاس آئے ہیں۔ اگر کچھ آپ بتا سکتے ہوں تو بتا دیجئے۔ ورنہ میرن خالہ کا پورا پتہ دے دیجئے۔ ان ہی سے گزارش کی جائے کہ حالات پر روشنی ڈالیں کسی کا گھر بسانا ثواب کا کام ہے جعفر صاحب!"

بالکل۔ بالکل" انھوں نے کہا اور سر ہلایا: "اتنا تو میں بتا سکتا ہوں کہ وہ لڑکا اچھے خاندان کا تھا۔ نجانے اس خاندان میں کیا چپقلش ہوئی کہ وہ لڑکا میرن بہن کے حوالے کیا گیا۔ یہ غالباً وہاں کی قدیم خاندانی اور معتبر کھلائی تھی کچھ تفصیل انھوں نے بھی اور خانہ زاد کی گھر والوں کو سنائی تو تھی۔ بات پرانی ہے دھیان سے اتر گئی ہے۔ بہرحال آپ اگر گدوال تشریف لے جائیں اور قصبہ میں پہنچ کر سکندر خاں کی ماں میرن بی کو پوچھ لیں تو میں سمجھتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی شناسا آپ کو ان کے پاس پہونچا دے گا" اتنا کہہ کر انھوں نے اچانک پوچھا: "لیکن اس خادم کا نام و پتہ آپ کو کس نے بتایا۔"

ایاز احمد ہی نے نشاندہی کی تھی" غیرارادی طور پر شکیب بول اٹھا۔

اچھا اچھا" انھوں نے خوش ہو کر سر ہلایا "معلوم ہوتا ہے کہ ناچیز کی شہرت ابھی جوں کی توں قائم ہے بلکہ ترقی پر ہے۔ خدا کی دین۔ اس کا کرم

سبحان اللہ۔ ایک زمانہ تھا کہ جس کسی سے پوچھ لیجئے۔ جعفر علی صاحب کرچی سینٹ کے صدر مدرس صاحب کے خادم خصوصی کہاں قیام فرماتے ہیں۔ بس اندھا بھی آپ کو خاکسار تک پہونچا دے۔ شہرت خدا داد چیز ہے صاحب!" وہ پھر ہنسنے لگے!" اچھا ہاں۔ اب یہ ایاز میاں چشم بد دور خاصے جوان آدمی ہو چکے ہوں گے کبھی ان سے کہئے کہ تشریف لائیں۔ بچپن میں تو اکثر جعفر زمانہ کے آنگن میں بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے!۔

اتنے میں اندر سے ایک بچہ لیمو کے شربت کے تین گلاس لکڑی کی ٹرے میں رکھے لیے آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ضیافت بیگم جعفر کی طرف سے تھی!۔ بہت کچھ تکلف کر کے انھوں نے گلاس سنبھالے اور کچھ دیر ٹھہر کے بڑے میاں کا شکریہ ادا کر کے اٹھ گئے!۔

شکیب کافی مسرور تھا۔ مگر ایاز بدستور خاموش اور فکرمند۔ شکیب کے استفسار پر بولا: میں جاؤں گا گدوال۔ اور میرن خالہ کو اپنے ساتھ لاؤں گا۔ میری ذات پر پڑا ہوا رموز و اسرار کا پردہ تو بہر حال اٹھے۔ یہ گومگو اور سکرات کی سی کیفیت تو دم گھونٹے دیتی ہے۔ اب صبر مجھ سے ناممکن ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی ادھوری گفتگو نے مجھے زیادہ مضطرب کر دیا ہے۔ وہ بڑی بی۔ بار بار کن نجمہ بی بی کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ کون تھیں یہ نجمہ بی بی نہ؟

میری مانو ایاز۔ تمھیں خدا کا واسطہ۔ اتنے پریشان نہ ہو۔ اتنی عجلت نہ کرو۔ ذرا صبر و ضبط سے کام لو۔ ہمارا یہ امتحان ختم ہو لے۔ ہم دونوں گدوال چلیں گے۔ اور ان محترمہ کو ساتھ لے آئیں گے یا پھر وہیں ان سے ساری کہانی سن لیں گے۔" شکیب بڑی خوشامد سے کہہ رہا تھا:" ہم کامیابی کے

قریب پہونچ چکے ہیں۔ با انشاءاللہ پوری کامیابی نصیب ہوگی مگر جہاں تم نے برسوں صبر کیا ہے۔ تھوڑا سا صبر اور کرلو۔ اتنا اہم سال مت خراب کرو۔ تمھیں میری قسم۔ میرے بھائی!۔ وعدہ کرو کہ یہ امتحان غارت کرکے اکیلے نہ بھاگ جاؤگے!"

"ہرگز نہیں۔!" ایاز نے بھی سنجیدگی سے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں! امتحان دوں گا اور پھر تمھارے ساتھ چلوں گا۔ تم تنہا وہ ہستی ہو۔ جو اپنی قسم دیے بغیر بھی مجھ سے اپنی ہر بات منوا سکتے ہو!۔

شکریہ میرے دوست۔ اس اعتماد اس خلوص کا بہت بہت شکریہ"

شکیب یوں مسکرایا کہ اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں!۔ اور تبھی اچانک ایاز کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

"شکیب! اپنی توہین اپنی دربدری کا احساس مجھے ڈس رہا ہے۔ کیا میری ذات اتنی حقیر تھی کہ۔ صنوبیہ تک نے۔ میری دلشکنی کی اور یہ نہ سوچا کہ۔ اس نے مجھے ہمیشہ اپنا دوست کہا تھا۔ صنوبیہ نے ۔۔!" اس کی آواز رندھ گئی۔

ایاز کے گھر سے چلے جانے کا تقریباً سب ہی پر اثر ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ خاموش تھیں۔ ان کا ضمیر انھیں کچوکے دے رہا تھا۔ سید صاحب تو بیمار ہوگئے تھے۔ وہ اس سے ہمیشہ ہی سے بہت محبت کرتے تھے!۔ انھیں کسی طرح یقین نہیں آرہا تھا کہ ایاز جیسا گھر کا پروردہ لڑکا اتنا شریف

معصوم اور نیک تھا۔ نہ چوری جیسی حرکت کا مرتکب ہو سکتا تھا۔ وہ بیچارے صدمہ کے مارے بستر سنبھال کر پڑ گئے تھے۔ ہاجرہ بھی بہت مغموم تھیں۔ ایاز کا لڑکپن ان کے ہاتھوں میں گزرا تھا۔! ملازمین تک اس کی عدم موجودگی کو محسوس کر رہے تھے۔ مگر سب سے زیادہ متاثر صنوبیہ ہوئی تھی!۔ وہ چونکہ نہایت ضدی، ضابطہ صابر اور کم سخن تھی۔ لہذا اپنے جذبات و محسوسات کو اپنی حد تک رکھنے پر قادر تھی لیکن دھڑکنے والے دل، سوچنے والے دماغ اور ملامت کرنے والے ضمیر کو کیسے خاموش کر دیتی!۔ اندر اندر وہ جل رہی تھی۔ پھنک رہی تھی اور بے چین تھی!۔ اس کی ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں! نہ اس کا دل پڑھنے لکھنے میں لگتا تھا نہ کسی سے بات چیت میں۔ پہروں وہ کھڑکی کھولے بیٹھی اسی رخ کو دیکھا کرتی۔ جہاں اب کچھ بھی نہ تھا!۔ باغ میں باد سموم چلتی تھی۔ خشک چرمرائے ہوئے پتے پختہ روش پر لوٹتے پھرتے تھے!۔ فوارہ گرم پانی کے موتی اچھالتا رہتا تھا۔ تند ہوائیں درختوں میں ماتم کیا کرتی تھیں۔ اور آم کے گھنے درختوں میں چھپی بیٹھی کوئل دن بھر دردناک صدائیں لگایا کرتی۔ پی کہاں۔ پی کہاں۔ ؟؟۔

اور تب صنوبیہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل جاتی۔ نامراد، ناشاد۔ بس پکارا کرے گی۔ تیرا پی جانے کون سے دیش اڑ گیا ہے۔ لمبی لمبی گرمی کی دوپہریں اس کی عجیب سی پد حواسی میں کٹ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا! جیسے وہ پچھلی صنوبیہ رہی ہی نہ ہو۔ یوں بھی اس کا طرز فکر فلسفیانہ تھا۔ اب تو زندگی اور زندگی سے وابستہ ساری دلچسپیوں کو وہ ہیچ سمجھتی تھی۔ ایک دن فنا ہو جانے والی چیز کا بناؤ سنگھار کیا۔ زندگی سے چمٹے رہنے والوں کو وہ تحقیر سے دیکھتی!۔ اور جب سے وہ ویرانی کی داستان

میں رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی تب سے اور زیادہ خاموش ہو گئی تھی تب
سے اور غصہ ور بھی اتنا ہی۔ ! اسے بہت
سے جذبے پریشان کر رہے تھے۔ ایک تو ارقم کی والدہ کی آرجار بہت
بڑھ گئی ہے۔ دوسرے یہ فکر کہ اگر وہ امتحان میں پاس ہو گئی تو ہاجرہ اور
نانی اماں زبردستی اس کو ارقم سے وابستہ کر دیں گی۔ یہ وہ کسی طرح نہیں
چاہتی تھی۔ ! مزید فکر یہ کہ سید صاحب ان دنوں پھر پرانے اختلاج
قلب میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ اور گونا گوں دکھ
میں گزری تھی ان کے تین جوان لڑکوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔
اپنے اپنے اعمال میں یوں الجھے ہوئے تھے کہ باپ کی خبر نہ لیتے تھے۔ ہاجرہ
کی زندگی کی بربادی نے بھی سید صاحب کو بہت دکھ دیا تھا۔ عمرانہ جو
باپ کی خدمت گزار تھیں۔ وہ بہت دور بیاہی گئی تھیں۔ برسوں میں صورت
دکھاتیں اور پھر مدتوں کے لیے جدا ہو جاتیں۔ ! سید صاحب اپنی مردانگی اور
گھر کے بزرگ ہونے کے خیال سے اپنے دکھ درد سب سے چھپاتے تھے۔ سوچتے
تھے کہ اگر وہی حالات کے آگے سپر انداز ہو جائیں گے تو پھر اوروں کو سہارا کون
دے گا۔ لیکن ان کی کیفیت اس فولادی شہتیر کی سی تھی جو بالآخر ایک دن
زنگ آلود ہو کر جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ٹوٹ چکے تھے۔ اگرچہ وہ
بہت معمر تھے مگر صنوبر انھیں اپنے سر پر ایستادہ مضبوط سائبان سمجھتی تھی۔
اس پر کوئی نازیبا ستم نانا ابا نہیں ہونے دیں گے۔ اب جو وہ بستر پر پڑے
تھے۔ تب اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کیا ہو گا اگر نانا ابا۔ اور آگے سوچتے
اس کا کلیجہ کانپتا تھا ! ۔

سید صاحب نے ایاز کے چلے جانے کا بہت اثر لیا تھا۔ وہ مسلسل سوچتے

رہتے تھے۔ اس پورے سانحہ میں کوئی نہ کوئی گرہ ایسی ضرور ہے جو کمزور ہے اور جس کے کھلتے ہی سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔ مگر وہ گرہ کون کھولے؟ وہ خود کو مجرم سمجھتے تھے۔ انھوں نے بیوی اور لڑکیوں کو سختی سے ڈانٹ دیا ہوتا تو آج پچھتاوے ان کی تقدیر نہ بن جاتے۔ ایک بے یار و مددگار یتیم بیس لڑکا ان کی غفلت اور کمزوری کا شکار ہو گیا۔ آج وہ کہاں ہے۔ در بدر کی کتنی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ یہی زندگی کے ڈر اس پر بیند کر رہے گئے اور ایک دن مالک کو نین ان سے حساب لے گا۔ ان سے پوچھے گا۔ ایک معصوم یتیم لڑکا آپ کی سرپرستی میں کیا تھا لیکن کیا ذمہ داری آپ نے نبھائی۔ وہ کنبہ والوں کے اتہام و ظلم کی نذر ہو گیا۔ آپ تماشہ دیکھا کیے۔ اب جواب دیجئے۔ اور اتنا سوچ کر سید صاحب پسینہ پسینہ ہو جاتے۔ لرزنے لگتے۔ نیم جان ہو جاتے!۔ ان کا کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ ان کے آثار خطرناک نظر آ رہے تھے اور یہ حالت دیکھ کر بیگم کو بھی اپنی زیادتی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ خدا سے توبہ کیا کرتیں۔ ارے انہی کی زبان تو تھی۔ جس نے اس غریب کو جلاوطنی کا حکم سنایا تھا۔ اگر اللہ ان کے شوہر سے پوچھے گا تو بھلا انہی کو کیوں چھوڑ دے گا؟۔ بلکہ ان سے تو اور کس کے پرسش ہوگی۔ وہ دوہری گنہگار تھیں۔ ایک تو شوہر کی مرضی نہ لی تھی دوسرے اپنی ذاتی ذمہ داری پر ایک بے خطا آدمی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ جبکہ وہ جانتی تھیں کہ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا!۔

ماں باپ کو ماجرہ دلاسے دیتیں۔ کیونکہ ان کی بیٹی کی رسوائی اور بدنامی کے خیال سے ماں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ دل کی جھوٹی تسلی دے کر وہ ماں باپ کو سمجھاتیں۔

"چھوٹا سا بچہ تو نہیں تھا۔ ابی جی۔ آپ نے ماشاء اللہ اُسے ہاتھ پیر کا کر دیا تھا۔ کسی دوست کے پاس چلا گیا ہوگا۔ آپ لوگ ناحق سوچ سوچ کر خون سکھا رہے ہیں۔ یہ بھی تو دیکھئے کہ آخر اس نے اتنی جسارت کیسے کی تھی کہ صنوبیہ کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اگر خدانخواستہ ـ!"

کچھ بھی ہو۔ بیدصاحب بولے "یہ بہت برا ہوا ہے۔ ہاجرہ۔ صنوبیہ کی حفاظت تمھاری ذمہ داری تھی۔ اور میں بھی ایاز کو کھاتا۔ اُسے یکبارگی گھر سے چلے جانے کا حکم کیوں دے دیا۔ ارے۔ تمھیں اسوقت پال کی ذرا محبت نہ آئی۔ زینب! زینب بیگم کے سینے میں شوہر کا ٹھنڈا لہجہ زہر میں بجھا ہوا نیزہ اتار دیتا۔ کم نصیبوں جلی کو یہی خیال کھائے جا رہا تھا کہ اللہ نہ کرے کوئی بات بدنامی کی ہوگئی تو پھر لڑکی کا رشتہ کیسے ہو سکے گا۔ ابھی آسیہ بہن دنیا بھر کے طعنے دے چکی ہیں۔ دن بھر ارقم گھر میں بنا رہتا ہے۔ کیا وہ سب کچھ نہیں دیکھتا رہتا؟"

امی۔ ارقم کا نام سنا صنوبیہ پسند ہی کب کرتی ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔ "ابھی کل ہی پرسوں کہہ رہی تھی کہ اگر زبردستی مجھے ارقم کے حوالے کر دیا گیا تو خودکشی کر گذرے گی۔ دور پار دشمن۔ وہ ضدی بھی ایسی ہی ہے۔ اللہ نہ کرے زور جبر کرنے سے کہیں خود پر تیل انڈیل کر ماچس دکھا دے۔ تب۔ زندہ رہیں گے پھر۔ ہم آپ!"

اگر صنوبیہ کی مرضی نہیں ہے تو میں کسی قیمت پر اسے مجبور نہیں کروں گا۔" بیگ صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔ ہاجرہ۔ تم اپنے لڑکوں کو ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہو۔ شبیر تمھارے حق میں مردہ زندہ برابر ہے۔ جبیر نے اپنے ماتھے پر داغ لگا لیا ہے۔ اب کیا تم لڑکی کو بھی ہاتھ سے کھونا چاہتی ہو۔ آخر تمھیں وہ

دو کاندار بیٹے کا۔ بچہ پسند کیا ہے؟ خوبی کون سی دیکھی۔ ہے تم نے ؟ بہت ہی بدتمیز گستاخ بے ادب کہیں کا۔ میرے سامنے پان چباتا جگالی کرتا ہوا آتا ہے۔۔۔ صنوبیہ تو صنوبیہ ہی ہے۔ میں بھی اُسے قطعی پسند نہیں کرتا۔ تم اس پر کس لئے لٹو ہو رہی ہو۔ مجھے وجہ بتاؤ!۔"

اے آپ کی بھی باتیں" ہاجرہ سے پہلے بیگم بول پڑیں "منجھلی دلہن کا بھائی ہے۔ بچپن سے اس کا نام صنوبیہ کے ساتھ۔!"

بس؟۔ اس ناقص العقلی پر ایک پڑھی لکھی سلیقہ مند، سمجھدار لڑکی قربان کر دی جائے گی؟" بیگم صاحب کو غصہ آنے لگا "میں کہتا ہوں۔ جب کی لگی بندھی منگنی جوانی میں آکے ٹوٹ جاتی ہے۔ جب نکاح تک فسخ ہو جاتے ہیں تو محض زبانی تذکرے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ ہاجرہ! اگر تم میرا یا تمہارا کوئی عزیز نہیں ہے۔ اسے یہاں روز روز آنے سے منع کر دو۔ اور۔ جب تمہاری سمدھن رشتے ناطے استوار کرنے تشریف لائیں تو انھیں میرے پاس بھیج دینا۔ میں یہ سارا قصہ ہی ختم کر دوں گا۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ ناگوار تذکرہ بار بار دوہرا کے تم نے بیچاری بچی کی زندگی تلخ کر رکھی ہوگی!"

ابی جی۔ پھر بھابی کیا سوچیں گی" ہاجرہ دبی زبان میں بولیں۔

بھابی اگر کچھ سوچیں تو ان سے بھی استدعا کر دینا کہ جس طرح عدیل اور جمیل نے گھر الگ کئے ہیں آپ بھی الگ کر لیجئے" رشید احمد نے کہا۔ کوئی ایسا فرق نہ پڑ جائے گا۔ لیکن میری بچی کو توفیق اللہ مند رہے گا!۔ مگر لڑکی کو آخر کب تک بٹھائیے گا۔ اللہ رکھے بیس۔ ہو رہی ہے" بیگم صاحبہ کی قسمت نے دھوکا دیا تو وہ بول پڑیں۔ بس اللہ نے بندے نے

شاید اپنی ازدواجی زندگی کے چالیس برسوں میں پہلی بار سیّد صاحب نے بیوی کو ایسی بے بھاؤ کی سنا دیں کہ بولتی بند کردی۔ ہاجرہ تو سہم کر دبک ہی گئیں بیوی کا یہ حال کہ چہرہ فق، دل کی دھڑکن بے قابو اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ گمان تک نہ تھا سیّد صاحب اس طرح تیغ بے نیام ہو جائیں گے۔ گرج برس کے انھوں نے بیوی اور بیٹی کو حکم دیا۔ اب میرے سامنے سے تم لوگ چلی جاؤ"!

بیگم کمرے سے نکلیں اور دالان میں آکر رونے لگیں۔ ہاجرہ وہیں بیٹھیں کچھ مبہوت کچھ پریشان۔ صنوبیہ سب کچھ دیکھ رہی تھی سن رہی تھی اسے اطمینان تھا کہ اس کے سر آئی بلا ہمیشہ کے لیے ٹل چکی تھی۔ وہ سیّد صاحب کے پاس جا بیٹھی۔

"بیٹی! مسدس حالی کے کچھ بند سناؤ۔ دل بہلے۔ میرا دماغ بے کار کر کے رکھ دیا ان ناسمجھ عورتوں نے" سیّد صاحب نے کہا۔ پھر بے جوڑ فقروں میں بولے "تم پریشان نہ ہو بی بی۔ اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ کوئی تمھیں مجبور کر کے اپنی مرضی نہیں منوا سکتا!۔

ابی جی" صنوبیہ نے چپکے سے کہا "آپ سے ایک بات کہنی ہے۔

کہو بیٹی بے جھجک کہو" سیّد صاحب اٹھ کر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گئے۔ اور پیار سے نواسی کا منھ تکنے لگے!۔

ابی جی۔ نجانے کیا جھگڑا ہے" صنوبیہ اور بھی دھیمی آواز میں ان کے پاس سرک کے بولی "صبح سے ابو اور تم اور جیسو بھابھی پچھلے برآمدے میں مسلسل بحث بازی کیے جا رہے ہیں۔ چند لفظ میرے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ بیتیا کیوں روپیے اور قیمت سے طلب کر رہے ہیں کر کہا۔ وہ انکار کر رہے ہیں۔ آپ ان کو

بلا کر پوچھیے۔ مگر انھیں نہ معلوم ہو کہ میں نے کہا ہے۔ یونہی جبیر بھیا مجھ سے خار کھاتے ہیں!"

"کسی ملازم کو آواز دو" بیگم صاحب نے کہا "وہ جا کے بلا لائے انھیں"

"اچھا امی جی۔!" صنوبیہ باہر نکلی۔ ادھر سے سید صاحب کے لیے حریرہ لیے صنوبر آرہی تھی۔ اس کا منھ پھولا ہوا تھا لب بھنچے ہوئے جیسے کسی سے خفا ہو! صنوبیہ نے اس سے ٹرے لے لی۔ اور بولی "تمھیں بڑے صاحب بلا رہے ہیں!"

یکبارگی صنوبر کے منھ سے نکلا "بڑے صاحب کو ہم بول دے گا صاجزادی ہمارا کچھ قصور نہیں۔ یہ آپ کے بھائیوں نے ہمارے کو درمیان میں گھسیٹ لیا ہے۔ اب دیکھو کہ بڑا صاحب ہمارا کیا گت بنائے گا! ۔ ارے مولی۔ ہم یہاں آیا کاہے کو تھا۔ توبہ توبہ۔!"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو" صنوبیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"تم بولو۔ صاجزادی۔ بڑا سرکار ہم کو کاہے کو بلا رہا ہے۔؟"

"ابھی سے جا کر پوچھ لو" صنوبیہ نے برا سا منھ بنا کر کہا اور ٹرے لے کر اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے صنوبر بھی چلی گئی۔ لیکن اس کا انداز عجیب جارحانہ تھا۔ جیسے ہر چہ باداباد کہہ رہی ہو۔

"کیا فرماتا سرکار۔!" صنوبر نے گستاخانہ لہجے میں پوچھا۔ اس کی یہی بدتمیزیاں کسی کو پسند نہ تھیں۔ سید صاحب نے اس کی بیہودگی نظر انداز کر کے کہا۔

"ذرا جبیر میاں اور راقم کو میرے پاس بھیج دو! کیا کر رہے ہیں۔ ان سے کہنا کہ فوراً آئیں۔!"

صنوبر وہیں کھڑی رہی۔ اور باری باری دونوں کو گھورنے لگی۔ صنوبیہ نے جھلا کر کہا "کیا ہے۔ تم جاتی کیوں نہیں۔!"

ہم کو بولو صاحب جلدی۔ یہاں ان لوگوں کو کیوں بلا رہا ہے" صنوبر نے کہا!
"تم سے مطلب؟" صنوبیہ کو غصہ آگیا۔ "جتنا تم سے کہا جا رہا ہے۔ وہ کرو!"
"عجیب لڑکی ہے۔ ہمارے معاملہ میں دخل دیتی ہے۔" حیدر صاحب
نے کہا۔ غصہ انھیں بھی آرہا تھا!۔
"جی صاحب۔ ہم ابھی سے بولے دے رہا ہے۔" صنوبر نے عجیب سے ٹھگ کار
والے انداز میں کہا: "اگر ان لوگ ہمارا نام لے گے آپ سے کچھ بولے تو ہم
اپنے بھائیوں کو ایسی کے انھیں اچھی طرح پٹوا دے گا۔ ہمیں وہ لوگ
ایک ہزار کا لالچ دیتا سرکار۔ اچھی بات ہے۔ ہم یہیں رہتا۔ آپ
ان سے پوچھ لو۔!"
"یہ کیا قصہ ہے۔؟" سید صاحب نے حریرے کا کٹورہ میز پر رکھ دیا
اور تعجب سے اسے دیکھنے لگے!۔
"وہی گرہ ابی جی۔ جو آپ کہہ رہے تھے کہ سارے قصے میں کہیں ہے اور
کسی سے کھل نہیں رہی ہے" صنوبیہ خفیف سا مسکرا کر بولی: "اب
شاید کھل جائے گی!۔
جاؤ۔!" وہ گرجی "بلا لاؤ انھیں!۔
"اچھا صاحب۔!" وہ طوعاً و کرہاً گئی اور سیدھی ارقم و جبیر کے سر دل
پر جا دھمکی۔ دونوں نے مڑ کر انھیں گھورا۔
"کیوں۔ کیا بات ہے!" ارقم تیز ہو کر بولا "پھر سر پر سوار ہو گئی ہو۔ کہہ
دیا ایک بار کہ ابھی پیسے نہیں دے سکتا۔ دس بارہ روز انتظار کرو۔!
انتظام نہیں ہوا ابھی"
"کہہ ہی رہا تھا کہ ایسے پنچ لوگوں کو رازدار نہ بناؤ۔!" جبیر بولا۔

یار تم نے گیم اچھا کھیلا۔ تمہاری راہ کا ہمالیہ تو سرک ہی گیا مگر تم نے اس
بے چاری کو اور مجھ گدھے کو غچہ بہت خوبصورت دیا۔ سچ مانو۔ میری اپنی بہن
کے فیوچر کا سوال نہ ہوتا تو ابھی تک میں نے تم سے سمجھ لیا ہوتا۔

نجانے تمہیں کیا غلط فہمی ہوئی ہے جبیر: ارتم نرم آواز میں بولا۔ ارے
کیا میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔ صرف یہی تو کہہ رہا ہوں کہ دس بارہ روز
انتظار کر لو۔ میں تمہیں بھی دوں گا نا۔ اسے بھی!۔ تم نے میرا ساتھ دیا ہے
تو کیا میں بھلا تم کو دھوکا دے سکتا ہوں!:

پہلے بڑے صاحب کے پاس چلو۔! بلاتا ہے: صنوبر نے دخل دیا۔

بڑے صاحب؟۔ دونوں کے منھ سے پھر ایک ساتھ نکلا: وہ کیوں
بلا رہے ہیں؟: چل کے پوچھ لو۔! صنوبر بولی: غصے میں بھرا ہوا ہے
بڑا سرکار:

ارے باپ رے!" جبیر نے کہا: میں تو نانا ابا کا سامنا نہیں کر سکتا!
لعنت بھیجی میں نے تمہارے دو ہزار پر۔ میں تو بھائی بھاگتا ہوں۔ تم
جانو۔ اور بڑے صاحب جانیں!" یہ کہہ کر بوکھلاتا ہوا جبیر اٹھا اور لمبے
لمبے قدم رکھتا برآمدے سے نکل گیا۔

صنوبر کے لبوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ تھی۔ ارتم سے بولی: تم بڑا
بہادر ہے نا۔ تم تو سرکار کے غصے سے نہیں ڈرتا۔ تم ہی چلو۔!:

"ارے کیا ان کے جوتے کھانے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔ میں نہ لینے
میں نہ دینے میں: ارتم بھی ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا: بڑے سرکار میرے
کون لگتے ہیں۔ میں کیوں ان کی گالیاں سنوں۔!"

ارے۔ تم بھی میدان سے سرکتا ہے ارتم میاں: صنوبر ہنس دی: صاحبزادی

سے شادی کرنے کو تم اتنے پاپڑ بیلا۔ اب ان سے شادی کون کرے گا!"

کہاں ہو۔ تم دونوں۔!" بیڈ صاحب کی چنگھاڑ برآمدہ والان میں گونجی۔ شاید وہ غصے میں بھر کر خود ہی انہیں بلانے چلے آئے تھے۔ صنوبر نے آنچل دانتوں میں دبا لیا۔ اور ارقم یوں اچھلا کہ اس کی ایک بار قند اسے زینوں سے نیچے لے گئی۔ دوسری چھلانگ میں وہ سڑک پر تھا! ایسی تیزی سے بھاگا تھا کہ ہوا کو پیچھے چھوڑ گیا۔

صنوبر کے قہقہوں سے بیڈ صاحب کو طیش آ گیا "بدتمیز لڑکی! کیوں ہنس رہی ہے"

ارے بڑے صاحب" وہ ہنستی چلی گئی "دونوں ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ چوری کھلنے کے ڈر سے۔ آپ کے غصے سے گھبرا کر۔ جبیر میاں اور ارقم میاں دونوں چمپت ہو گیا۔ صاحب!" سب لوگ وہاں آ گئے تھے۔ اور تعجب سے صنوبر کو دیکھ رہے تھے۔ ارقم، جبیر کا فرار، صنوبر کا ہنسنا۔ ان کے لیے معمہ تھا۔ بالآخر بیگم صاحبہ ہی نے پوچھا۔

"بگڑی کچھ دماغ چل نکلا ہے کہ بس کھی کھی کیے جا رہی ہے۔ اری مرادوں جلی۔ میں پوچھتی ہوں کوئی بھاگے کہ رہے تیرے اس طرح ہنسنے کا مطلب کیا ہے؟۔ جلدی سے بتا دے۔ نہیں تو ابھی تیری ہنسی کو رونے میں بدلتی ہوں!"

"ہم تو سب کچھ بول دے گا بڑی اماں۔ پر آپ بڑے صاحب کے غصے سے ہم کو بچا لو۔ ہمارا نوکری تو سمجھو کہ اب گیا" صنوبر نے کہا۔

صنوبیہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ نجانے کیا کہے گی وہ۔ صنوبر نے مزے لے لے کر سارا ماجرا سب کے سامنے کہہ سنایا۔

"ایک دن چھوٹے گھے پاس والا کوٹھری میں چھپ کے ارکم میاں اور جبیر میاں ہیبا مانک بات کر رہے تھے بڑے صاحب اگر کسی بھی طرح سے ایاز میاں کا پتہ کاٹ دیں تو صاحبزادی سے ارقم میاں کا شادی بن جائے گا۔ ورنہ وہ ایاز میاں کی طرف جھکا رہا ہے۔" "کیا بکواس ہے یہ" صنوبیہ سرخ ہو کر بولی۔ "ہم جو سنا ہے وہ بولتا ہے۔ صاحبزادی" صنوبر نے کہا: "آپ مانو کہ نہ مانو آپ کا مرضی۔ وہ لوگ ایسی مانک بات کرتا تھا اچانک ہم کو دیکھ لیا۔ ہم ان سے بولا کہ اگر ہم صاحبزادی کے نانا سے تمہارا سازش کا بات بول دیا تو تم لوگ کہاں رہیں گا۔ تب ارقم صاحب کہا کہ صنوبر ہم تجھے ایک ہزار کی رقم دیں گا۔ تم کسی بھی طرح ایاز میاں کو صاحب کی نظروں سے گرا دو۔!"

"یا خدا یہ مکاریاں۔ میرے گھر میں۔ میری ناک تلے؟" بیگم نے سینہ پیٹ کر اور آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"گرہ اب کھل رہی ہے بیٹی۔!" سید صاحب نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اور صنوبر سے بولے: "اچھا پھر۔ دیے انھوں نے ایک ہزار روپیے؟"

"دینا کہاں سے کیونکہ کوڑی تو بدمعاش کے پلے نہ تھی۔" منجھلی دلھن کے منھ پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔! ان کے دلارے بھائی کے جوہر سب کے سامنے کھل رہے تھے۔ ان پر گھڑوں پانی پڑ رہا تھا!۔

"نہیں دیا صاحب۔!" صنوبر نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "مگر ہم ایک دم الو کا موافق ہے۔ پیسوں کے لالچ میں آ کے ایاز میاں کو برا بنا دیا۔ انھیں چوری میں پکڑا دیا۔ اللہ صاحب ہم کو آگ میں ڈال دیں گا۔"

"وہ ڈھائی ہزار" ہاجرہ نے دبی زبان سے کہا۔

"جی بی بی جی۔ وہ ڈھائی ہجار روپے" صنوبر نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

بڑے سرکار نوٹ گن رہا تھا تب جبیر میاں دیکھ رہا تھا۔ پھر نوٹ سرکار شیروانی کا جیب میں رکھ کے سو گیا تھا۔ اور ایاز میاں جوان کے ساتھ آیا تھا۔ وہ حکیم جی کے انتظاری میں ادھر والے کمرے میں جا کے بیٹھ گیا تھا۔ پھر کیا ہوا بیگم صاحب کہ آپ کی خالہ کا موت ہو گیا۔ آپ سب بہوت جلدی میں چلا گیا تب ارقم میاں شیروانی میں سے نوٹ نکال کے میرے کو دیتا کہ جلدی سے جلدی جا کے ایاز میاں کے سوٹ کیس میں چھپا دو۔!"

تمھاری ایسی کی تیسی۔ تم نے چھپا کیوں دیئے" عزرا نے دانت پیس کر کہا۔ "تبھی ہم میں سے کسی سے یہ بات کیوں نہ کہہ دی۔ بے چارہ بے گناہ مارا گیا نا۔ تم نے اتنا بھی نہ سوچا۔؟"

"عزیزوں نے نہ سوچا تو وہ بے چاری کیا سوچتی۔!" اجرہ نے پرنفرت لہجے میں کہا: "اے میں کہوں یہ بدنصیب صورت حرام جبیر ایسا سازشی کیسے ہو گیا۔ بہن پر داغ لگانے اسے حیا نہ آئی۔ خدا اس کی بیٹی عزیز کر لے۔ یہ اولاد تو بچے ڈوب مرنے پر مجبور کر دے گی۔" وہ مارے شرمندگی کے رو پڑیں۔ صنوبر نے ایک نگاہ ان پر ڈال کر کہا۔

"ہم سے بہوت بڑا غلطی ہو گیا اماں۔ بہت بڑا غلطی۔ جب ہم ایاز میاں کے کمرے میں گھس کر نکلا اور ارقم میاں کے کہنے پر ڈوپٹہ وہیں چھوڑ دیا تو ہمیں بے حد ڈر لگا کہ اب کیا ہوگا؟ پر ہم سمجھا کہ خالی خولی گالم گلوچ پر بات ختم ہو جائے گا۔ یہ ایاز میاں کو چور سمجھ کے نکال دیں گے کر کے ہم کو معلوم نہ تھا۔"

صنوبر کا خون پک رہا تھا۔ زہرفشاں لہجے میں بولی۔

"اور وہ خط جو تم نے مجھے ایاز صاحب کی طرف سے دیا تھا۔ اس کا کیا قصہ ہے؟۔ چور تو انھیں بنا ہی دیا تھا۔ پھر قرار کیوں نہ آیا۔؟"

صنوبر نے فرط ندامت سے مرتعش آواز میں کہا: "وہ بھی منجھلی دلھن کا بھائی خط دیا تھا۔ اس میں کیا لکھا تھا۔ صاحبزادی آپ ان سے ملنے کیوں گیا تھا۔ ہم کو معلوم نہیں صاحبزادی۔؟"

آناً فاناً معاملہ صاف ہو گیا۔ سید صاحب کا یہ حال تھا کہ مارے طیش کے آگ ہو رہے تھے۔ غصے سے لرزتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"کہاں تک بھاگے گا یہ جبیر کا بچہ۔ پاجی۔ اور کتنی دور جائے گا۔ قسم انھیں بلاؤں گا اور کھمبوں سے باندھ کر مارے ہنٹروں کے کھال گرا دوں گا۔ اُف فوہ۔ ایسی رکیک سازش۔ گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ اور یہ لونڈے جو ہمارے سامنے کل تک ننگے پھرتے تھے۔ ہمارے سامنے گھٹنوں چل کر بڑے ہوئے۔ نہیں۔ خدا کی قسم نہیں۔ میں ان مردودوں کو معاف نہیں کر سکتا! خبردار۔ اگر ان دونوں خبیثوں نے میری دہلیز پر قدم کبھی رکھا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیا کر گزروں گا۔ اگر کسی نے مارے محبت کے انھیں گھر میں بلا لیا تب میں سب کو اپنے گھر سے نکال باہر کر دوں گا۔ کان کھول کر سن لو۔ یہ مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہو گیا ہے آہ۔ وہ بےچارہ بے گناہ ساری خطائیں اپنے سر لے کر یہی کہتا تھا کہ شاید وہ کابوس کا مریض ہے۔ سوتے میں جرم و گناہ اس سے سرزد ہو گئے ہیں۔ اور یہ۔ کوئی حد ہے شرارت کی۔ اور یہ ہمارے خاندان کے بدمعاش۔!" ان کی تقریر بے ربطی کی نذر ہو گئی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ سانس دھونکنی بن گئی۔ منھ سے کف جاری ہو گیا۔ سب

پر چیخ چلا کر ان کی طرف جھپٹے۔ کسی نے چہرے پر ۔۔۔۔۔۔ ہوا کی۔ کسی نے ٹھنڈا پانی پلایا۔ کسی نے سینہ سہلایا۔ اور سب نے مل کر انھیں آرام سے لٹا دیا۔ مگر وہ غصے اور پچھتاوے کے ہجوم میں از خود رفتہ سے بڑبڑا رہے تھے:

"نہیں۔ قرار نہ آئے گا مجھے۔ ہرگز نہیں۔ بلاؤ اسے۔ تلاش کرو اس کو۔ کہاں ہے وہ۔ جب تک۔ وہ۔ میرے سامنے نہ آجائے گا۔ میں سکون کی سانس نہ لے سکوں گا۔ جاؤ۔ وہ جہاں کہیں ہو اسے میرے پاس لاؤ۔ میرے پاس لاؤ۔!"

ان کی آواز ڈوب گئی!

"کہاں سے لائیں اسے؟" بیگم کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو رہی تھی۔ "چلی جا مردار، سامنے سے چلی جا:" آجرہ غم کے مارے چلا کر صنوبر سے بولیں۔ "تجھے یہ سب کہنا تھا تو ہم سے کہا ہوتا۔ ابی جی کے سامنے کیوں کہا۔ انھیں کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ ہائے۔ خدا ان باجیوں کی مٹی عزیز کرلے۔ جنھوں نے یہ دن دکھایا ہے۔! اب بول شیطان کی بچی کہ ایاز کو کہاں سے لائیں؟!" کچھ دیر بعد سید صاحب کو ہوش آگیا۔ عمرانہ نے غفور کو دوڑا کر ڈاکٹر صاحب کو بلایا تھا انھوں نے دیکھا بھالا اور دوائیں دیں۔ اطمینان دلایا کہ ہنگامی پریشانی کا اثر ہے۔ دل دماغ کمزور ہو رہے ہیں۔ کچھ ایسی بات نہیں کہ جس میں خطرہ ہو۔

سید صاحب اب واقعتاً بیمار تھے۔ جسمانی تکلیف روحانی اذیت کے آگے گرد ہو گئی تھی۔ یہ احساس انھیں آہستہ آہستہ قتل کر رہا تھا

کہ وہ ایاز بے گناہ کی دربدری کا باعث بنے تھے۔! بس ان کی زبان پر یہی تھا کہ ساری دنیا میں تلاش کرو اور ایاز کو لاؤ!۔

انجکشن کے اثر سے جب وہ بے خبر ہو گئے تب سب میں مشورے ہونے لگے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔!

"یہ سچ مچ غلطی تو بہت بڑی ہوئی" بیگم نے کہا: "اسے میں نے گھر سے نکال دیا۔ اگر بھنک بھی مل جاتی کہ یہ ان شیطانوں کی چال ہے تو یقین مانو کہ انہی کم بختوں کے گھر سے نکال دیتی۔ کم سے کم ان کی یہ حالت تو نہ ہوتی۔ اب کیا ہوگا۔ کہاں ڈھونڈیں گے اسے۔ جانے خانہ آباد گیا کہاں ہے۔!

کہاں جائے گا بے چارہ" عمرانہ نے بڑے قلق سے کہا: "اپنے پورے سات سو روپے بھی تو آپ کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ کسی معمولی ہوٹل یا سرائے میں بیٹھا ہوگا!۔ جانے کھایا پیا کہاں ہوگا۔!

"صنوبیہ کیا تمہیں نہیں معلوم" ہاجرہ نے پوچھا: "اس نے کسی دوست کا نام پتہ۔ کبھی تذکرہ اس نے تم سے کیا ہوگا!۔

ایک صاحب تو ہیں۔ اکثر یہاں آتے بھی رہتے" صنوبیہ پرخیال انداز میں بولی: "شکیب الدین ان کا نام ہے۔ میں ان سے ملی بھی ہوں۔ مجھے انھوں نے نوٹس بھی دیے تھے۔ مگر وہ رہتے کہاں ہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم!"

"ارے تو پھر اب ہوگا کیا!" ہاجرہ نے وحشت سے کہا۔

"آج کل شکیب بھائی کا سالانہ امتحان ہو رہا ہوگا" صنوبیہ نے سرسری لہجہ بنا لیا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اس کی تشویش، توجہ اور

بے قراری کہیں اس کی پوشیدہ محبت کا بھرم نہ کھول دے۔ غیر اہم انداز میں بولی: اگر شکیب بھائی سے مل کر معلوم کر لیا جائے تو شاید کچھ کام بن سکے۔ اور اس کے سوا بھلا کیا ہو سکتا ہے!"

"تو بیٹی تم ہی جاؤ۔ تم تو یونیورسٹی جاتی رہتی ہو۔ بیگم نے اپنے سہاگ کی خاطر آنچل تو اسی کے سامنے پھیلا دیا: اور یہاں کون نگوڑا مرا ہے کہ نانا جان کی سلامتی کی خاطر سر گاڑی پہیہ کرے۔ جسم جلوں نے تو جان ہی لینے کی ٹھان رکھی تھی۔ نہ تو کچھ سویرے ہی آنکھ کھل گئی!"

"میں جاؤں گی نانی اماں۔ ابی جی کے لیے اگر میری جان بھی کام آجائے" صنوبیہ نے کہا اور فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا کہ دل کی لگی کوئی جان نہ لے!!"

امتحان ہال سے صنوبیہ باہر نکلی۔ تو دھوپ کی تیزی نے پلکیں بند کر دیں۔ روزہ وہ گھر جانے سے پہلے اپنے کالج کے کینٹین میں ایک دو کپ آئس کریم ضرور رکھا لیتی تھی۔ پھر اس کا رکشا آجاتا تھا۔ آج بھی اتنی ہی سخت گرمی تھی۔ تیز چبھتی ہوئی دھوپ تھی مگر اسے موسم کی مہربانی کا رتی بھر احساس نہ تھا۔ اس کی سہیلی نے اسے کینٹین چلنے کی دعوت بھی دی تھی۔ لیکن وہ معذرت کر کے بڑے گیٹ پر آگئی اور اپنے رکشے کا انتظار کرنے لگی۔ اور پھر اس پر مسرور گم

جذبوں نے یلغار کر دی۔ سر د رکن ایسے جذبے جن میں ندامت اور خجالت اور پچھتاووں کی بھی آمیزش تھی!۔

اسے آج شکیب کے گھر جانا تھا۔ ایک روز قبل اس نے تھرٹیش ہیلڈ یونیورسٹی جا کے شکیب کا پتہ معلوم کیا تھا!۔ کیونکہ سیّد صاحب بدستور بیمار تھے اور ان کا تقاضا تھا ترتی یہ تھا کہ کسی طرح ایاز کو ڈھونڈا جائے انھیں خدا کی پرسش کا خوف نیم جان کیے دے رہا تھا! وہ کہہ چکے تھے کہ شدید ڈیپریشن کے آئندہ حملے کے بعد وہ جانبر نہیں ہو سکتے۔ اور پھر۔ بتر دسوال جواب کا کٹھن مرحلہ۔ سیّد صاحب روز بروز بدتر ین کی طرف جا رہے تھے۔ اور ضروری ہو گیا تھا کہ انکی خواہش کی پا بجائی کی جائے۔ اس کے علاوہ وہ کیا صنوبیہ کے اپنے دل کی لگی نہ تھی)۔ وہ بھی ایاز سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر اسے لعنت ملامت کی تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کن الفاظ میں اور کس پیرایہ میں وہ اس سے کہے گی کہ اسے معاف کر دے اور پھر سے گھر چلے! وہ گھر سے نکل گیا ہے۔ اور صنوبیہ کے جسم سے زندگی، دل سے خون، آنکھوں سے دید کی تڑپ اور روح سے سارے ارمان نکل گئے ہیں۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی بھلا! اتنا لمبا بے محل ڈائیلاگ اس سے بولا بھی جائے گا؟۔ نہیں۔ وہ بس۔ معافی طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ لے گی۔ وہ خود ہی سمجھ جائے گا کہ صنوبیہ پشیمان ہے۔ مگر وہ بدھو کتنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں وہ الٹی معافی مانگنے لگے!۔ ارے اللہ تب تو ہنسی روکنا مشکل ہو جائے۔ سچ مچ وہ سیدھا سادا تو ایسا ہی ہے!۔

رکشا آگیا اور وہ امید و بیم کے بحر بیکراں پر بہتی شکیب انصاری کے مکان کی طرف چلی!۔

کالج سے شکیب کے مکان کا راستہ اتنی دور بھی نہ تھا لیکن صنوبیہ کو لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے اس سڑک پر رواں دواں ہو!

خدا خدا کر کے رکشا گھر کے دروازے پر رکا!۔ صنوبیہ نے اتر کر دہلیز کے اوپر آس پاس کال بیل تلاش کی مگر دکھائی نہ دی۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔ دفعتہً دروازے سے ایک نوجوان نکلا اور چلا اٹھا۔

"ہیلو۔ آپ صنوبیہ ورما جی!" وہ شکیب کا چھوٹا بھائی ظہیر تھا۔ "ارے۔ آپ خدا نخواستہ اپنے دولت کدے کا راستہ بھول کر غریب خانہ پر تو نہیں آ نکلی ہیں۔ یا پھر گرمی کے مارے میرا دماغ چکر میں آیا ہوا ہے۔ میں ہی آپ کے گھر آ گیا ہوں!" پھر اس نے شرارت سے چکر مکر دیدے نچائے جیسے اس کی آمد کی وجہ معلوم کر کے محظوظ ہو رہا ہو۔ صنوبیہ کے گال دہکنے لگے تھے۔ اب یہ بدمعاش اُلو بنائے گا!۔

"بڑے تمیزدار بچے ہو کہ دھوپ میں کھڑا رکھا ہے۔!" وہ جھوٹ موٹ بگڑی۔ "اوہ معاف کیجئے گا۔ آپ کو دیکھ کر میں ہوش حواس میں نہیں رہا تھا۔ آئیے آئیے۔ اندر تشریف لائیے!" اس نے پہلے پیر لوٹ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا اور دو دو سیلنگ فین چلا دیے۔

صنوبیہ گویا جہنم سے جنت میں آگئی۔ کیسی پرسکون ٹھنڈک تھی یہاں۔ وہ آرام سے ایک دیوان پر بیٹھ گئی!۔

فرمایئے۔ کیسے بلاؤں؟" وہ مسکرا رہا تھا۔ "اماں بھی ہیں۔ حوری بھی ہیں اور۔ اور۔ بس آگئے فل اسٹاپ" اس نے منھ بند کرلیا۔

"سنو! مجھے اماں کے پاس پہونچا دو! غیروں کی طرح یہاں کیوں بٹھال رکھا ہے" صنوبیہ بولی۔ "اور پھر مجھے خوب ٹھنڈہ پانی پلانا۔!

"آپ۔ آپ تشریف رکھئے" وہ اندر جاتا ہوا بولا۔ "میں اماں اور حوری باجی کو یہیں بھیجے دیتا ہوں اور اعلیٰ درجہ کا شربت روح افزا۔" وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ اور صنوبیہ گلابی ہوکر رہ گئی۔

دو ہی منٹ بعد اماں اور حوری آگئیں۔ وہ متعجب بھی تھیں اور مسرور بھی۔ صنوبیہ نے اماں کو سلام کیا اور انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ حوری ایک ننھی سی چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی تھی۔!

"اللہ اللہ۔ صنوبیہ" حوری بھی دیر سے بھرا کر بولی۔ "تمہاری بے مروتی۔ اگر آج ہمارے پاس ایاز بھائی آکے نہ رہتے تو تمہاری بھی زیارت کاہے کو ہوتی۔! کیا سچ مچ ہمیں بھول ہی گئیں۔؟!

ملازمہ شربت لے آئی۔ پھر تینوں اطمینان سے باتیں کرنے لگیں۔ صنوبیہ کا بےچین دل اب پرسکون تھا! پتہ چل گیا تھا کہ ایاز یہیں تھا۔ اسے توقع تھی کہ کچھ ہی دیر بعد پردہ سرکے گا اور وہ دکھائی دے گا! انتظار تو ختم ہوچکا ہوگا!۔ اب اس کے آنے میں دیر کتنی ہے!۔ رہ رہ کر وہ چونک کر کسی آہٹ پر اس کی سمت دیکھنے لگتی!۔ حوری کی باتوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہو رہا تھا! اماں اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ ہاجرہ کے دلہن اور گزر بسر کے بارے میں دریافت کر رہی تھیں۔ اس سے پوچھ رہی تھیں کہ کیا اسے اپنے باپ کی یاد

نہیں آتی۔ کیا نیاض صاحب اسے بھی نہیں پوچھتے۔ انھیں تعجب تھا عجیب باپ تھے وہ۔

ہاں شاید پچیس سال گزر چکے" صنوبیہ کچھ خجل ہو کر بولی "والد صاحب نے ممی سے مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔ ممی ہم لوگوں کو لے کر نانا کے پاس چلی آئی تھیں۔ سنا ہے کہ والد صاحب نے دوسرا نکاح کر لیا تھا اور ان کے اور بھی بچے بالے ہیں۔ پتہ نہیں۔

ہائے تم نے اپنے دوسرے بہن بھائیوں کو دیکھا نہیں۔ بلیس نہیں ان سے" حوری بولی مجھے ان سب سے نفرت ہے" صنوبیہ نے ناخوشگوار لہجہ میں کہا "جس شخص نے میری ماں کو تکلیف دی ہو۔ ان پر طلاق کا کلنک لگا دیا ہو۔ بھلا اس سے مجھے دلچسپی کیا۔ میں نے آج تک اپنے باپ کی صورت بھی نہیں دیکھی!۔

عجیب ماں باپ عجیب اولاد ہے۔ زمانہ ہی نرالا ہے بیٹی!" اماں نے کہا۔ صنوبیہ اکتا رہی تھی۔ آخر یہ لایعنی باتیں کب تک۔ ایاز کب آئے گا۔ جب اس کا صبر جواب دینے لگا تو اس نے پوچھ ہی لیا "حوری! شکیب بھائی کب آئیں گے!۔ مجھے ان سے کچھ کام تھا اسی لیے تو اتنی تیز گرمی میں چل کر یہاں تک آئی ہوں!"

شکیب بھائی یہاں کہاں ہیں!" حوری بولی۔

کیا مطلب؟" صنوبیہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

اے ان ناسمجھوں کی جلدبازی اور عجلت کیا کہوں" نہ ابکی اماں نے لقمہ دیا "تمھارے یہاں سے ایاز میاں آئے۔ ایک دن بخار میں پڑے رہے۔ دوسرے روز سے سالانہ امتحان شروع

ہو گیا۔ تین پرچے دیے تھے۔ کہ وہ پرچے ہی کچھ آگیا۔ کیا کہتے ہیں اُسے؟"
"گیپ۔؟! صنوبر نے ٹکڑہ پکڑ لیا۔
ہاں۔ یہی موا گیپ" اماں نے منہ بنا کر سلسلہ جاری رکھا "شاید تین دن کا تھا اس میں شکیب نے لاکھ لاکھ کہا کہ اگلے پرچوں کا مضمون پڑھ لیں مگر ایاز میاں کو قرار کہاں تھا۔ شکیب کو لے کر اپنی کھلائی کی تلاش میں گدڑال چلے گئے ہیں۔
کھلائی کی تلاش میں!" سانس روک کر صنوبر نے دوہرایا۔
ہاں۔ بچوں کی سی ضد" اماں بولیں "انھیں تو مارکے بے چینی لگی تھی کسی سے معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی کھلائی خالہ بیرن کو معلوم ہے کہ ایاز میاں کے ماں باپ کون تھے۔ کہاں تھے اب کہاں ہیں۔ سو ان کو کھوج لگ گئی۔ شکیب کو لے کر گئے ہیں کہ سب کچا چٹھا معلوم کر ہی کے آئیں گے!۔ اب اگلے پیر کو پھر امتحان ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں، اتوار کی سہ پہر تک آجائیں گے! تم ایاز میاں ہی کی خاطر آئی ہو نا بیٹی؟۔ سچ کہنا!۔
جی اماں!" لگی لپٹی رکھنا اور جھوٹے بکنا صنوبر کو نہیں آتا تھا۔ وہ صاف صاف بول دی "دراصل ہم لوگ ان کی طرف سے کچھ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ اب وہ رفع ہو چکی ہے۔ میں اسی لیے آئی ہوں کہ انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ یا ان تک اطلاع پہونچا دوں کہ ابی جی بہت بیمار رہیں۔ انھیں یاد کر رہے ہیں۔ وہ جب کبھی یہاں آئیں۔ فوراً ابی جی سے ملیں۔ ورنہ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ پھر پچھتانا پڑے۔!
خدا نہ کرے۔!" اماں نے کہا۔ پھر بولیں "مگر یہ شرارت کس کی

ننھی بیٹی۔ بچے بے چارے کو یوں تم سب نے دربدر کر دیا۔ ارے وہ تو یہاں آکر ایسا رویا ہے کہ یوں لگتا تھا جان سے گذر جائے گا۔ یہ ہوا کیا تھا؟"

جبیر بھائی اور شازیہ بھابی کے بھائی کی سازش تھی اماں" صنوبیہ بولی اور پھر من وعن پورے واقعات سنا دیے۔ اس کے بعد بولی "آپ کو ان کے آنے کے بعد موقع ملے تو جو کچھ میں نے کہا ہے۔ ان سے کہئے گا!"

ہاں۔ اچھا ہے۔ دل صاف ہو جائیں" اماں نے کہا "ورنہ کون جانے۔ مرد آدمی ہے۔ دل میں بات رکھ لے۔ زمانہ اچھا نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کسی سے بیر باندھنا کیا۔ مگر حیران ہوں۔ یہ ان لڑکوں نے گھر ہی گھر میں کتنی بڑی بات کی۔ توبہ۔!

اچھا اماں۔ میں اب چلوں!؟" صنوبیہ بولی۔

واہ بی بی ہوش کی دوا کرو۔ ابھی سے چلوں کیسے؟" اماں اٹھتی ہوئی بولیں "ایسی جلتی ہوئی بھری دوپہر میں آئی ہو۔ کھانا وانا کھا کے ذرا موسم ٹھنڈا ہو لے تو چلی جانا۔ میں باورچی خانہ دیکھوں تم تب تک حوری سے باتیں کرو!" صنوبیہ نے لاکھ احتجاج کیا مگر اس کی کسی نے ایک نہ سنی۔ بڑی بی اٹھ کر چلی گئیں اور ان کے جانے کے ساتھ ہی حوری ایک آنکھ بند کر کے شرارت سے مسکرانے لگی! صنوبیہ نے جھینپ کر کہا۔

"ماشاء اللہ خوب لفنگوں کی سی عادتیں اختیار کی ہیں۔ مجھے آنکھ مار رہی ہو"

بھابی۔ تمھارا چقندر سا رنگ خوب چغلی کھا رہا ہے کہ ایسے موسم

میں جبکہ چیل انڈا چھوڑ دے۔ تم کس کے فراق میں نکلی ہو۔ حوری بولی؛ ہائے۔ بڑے خوش قسمت ہو ایاز بھائی۔ تم سی حسین بیوی جسے ملے۔

وہ ــــ!"

اے۔ پاگل ہوئی ہو کیا۔ سچ مچ چقندر ہو کر صنوبیہ نے کہا اور اس کی پیٹھ پر دھکا رسید کر کے ہنس دی؛ "تمھاری تو وہی مثل ہے کہاں کی اینٹ، کہاں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ یہ میاں بیوی کی کیا بکواس ہے؟"

اچھا تو پھر ایاز بھائی نے کیوں تمھارا نام لے لے کے چار چار سیر کے آنسو بہائے تھے کہ ہم سب رفیق انقلابیہ لوگ ان کا ساتھ دینے لگے تھے۔ حشر اٹھ گیا تھا گھر میں۔ سب سے زیادہ یاد ان کو تمھاری آ رہی تھی۔ قسم سے اگر شہر میں کہیں صحرا ہوتا تو وہ گریبان پھاڑ کر خاک چھاننے نکل گئے ہوتے!"

بکواس تو کرو نہیں۔ ان کی زندگی دیکھتے ہوئے اگر ــــ"

حوری نے بات کاٹ دی؛ "تمھارا انھیں گلے لگانا حق ایمان ہے"۔

حوری دیر تک اسے چھیڑتی ستاتی رہی۔ پھر ماں نے دونوں کا کھانا بھجوا دیا۔

تین بجے سہ پہر کو جب صنوبیہ گھر واپس آ رہی تھی تو خوش تھی کہ سیٹھ صاحب کو اطمینان دلا سکے گی! اور اسے خود بھی اطمینان تھا۔ ایاز کو مخلص ساتھی اور ایک چھت تو بہر حال نصیب ہوئی تھی!۔

سیٹھ صاحب نے سارا قصہ سن کر لمبی سانس لی تھی؛ "ہاں! دیکھو۔ یہ یہ تین پہاڑ سے دن مجھ پر سے کیسے گذرے ہیں!۔ خدا کرے کہ وہ چلا آئے میں بس اس سے معافی مانگ لوں۔ پھر چاہے وہ مجھ پر لعنت بھیج کر چلا جائے

نہیں سمجھوں گا۔ میں اسی لائق تھا!"

اب پھوپی، بیٹی اور بہو سید صاحب سے خائف رہنے لگی تھیں۔ ان سب کے دلوں میں چور تھا! کیونکہ وہ لوگ طبعاً شریف تھے۔ ایسا کام کبھی نہ کیا تھا کہ ضمیر کچوکے دیتا۔ اب جو سانحہ سامنے آیا تھا۔ اس میں بلا واسطہ سب ملوث تھے۔ ہاجرہ کا بیٹا جبیر، بہو کا بھائی ارقم اور بیگم صاحبہ۔ جنھوں نے ایک ناکردہ گناہ کو جلاوطنی کا حکم سنایا تھا۔ درپردہ سب کو ایاز کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا!۔ اور انھیں کامل یقین تھا کہ وہ سید صاحب کا پیغام پاکے اور یہ معلوم کرکے کہ صنوبیہ اسے بلانے گئی تھی۔ ضرور چلا آئے گا!۔

صنوبیہ کی بچپن کی زبانی منگنی تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔ آسیہ بیگم کون سا منھ لے کر یہاں آتیں۔ صنوبر کو بیگم صاحبہ نے تبھی جواب دے دیا تھا۔ ایسی فتنہ ساماں لڑکی نجانے اور کیا گل کھلاتی؟ سب سے زیادہ خوش صنوبیہ تھی۔ اسے بے قراری یہ تھی کہ دیکھئے ایاز کی شخصیت سے وابستہ کون سا راز سامنے آتا ہے۔ وہ دعا بھی مانگتی تھی کہ ایاز کو اس کے ماضی کے واقعات معلوم ہو جائیں۔ ورنہ دوسری صورت میں ایسا نہ ہو کہ کہیں وہ دل شکستہ اور مایوس ہو کر کوئی اور لائحہ عمل نہ اپنا لے! قریب قریب سب کو اس کا انتظار تھا!۔

گھر پھر اپنے محور پر چل نکلا تھا۔ سید صاحب اب بھی گزرے خیالوں کے مارے ہوئے گھنٹوں چپ چاپ پڑے سوچا کرتے!۔ کبھی انھیں اپنے تینوں ناخلف بیٹوں کی یاد آتی۔ کبھی ہاجرہ کی پوری برباد زندگی انھیں دکھ میں مبتلا کر دیتی۔ وہ آہیں بھر کر رہ جاتے۔ کیا اعلیٰ اٹھان

تھی ماحول کی۔ انجام کیسا المناک ہے کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں سب کو اپنی اپنی پڑی تھی!۔

عمرانہ دو ایک روز میں نجانے کتنے برسوں کی مدت کے لیے جانے والی تھیں۔ گھر کے ایک اور فرد کی کمی ہو جائے گی! وہ سوچتے۔ کاش ہاجرہ کے لڑکے شبیر اور جبیر ہی کام کے نکلتے! ان دونوں نے تو خاندان ہی کا نام ڈبو دیا تھا۔ جبیر نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

وقت بہت تھم تھم کے گزر رہا تھا! گرمی کے طویل گرم دن جسم و جان کو جھلساتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کٹ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے اتوار کا ہمالیہ بھی آہستہ آہستہ لمحوں میں بکھر کر غائب ہو گیا اور دوشنبہ کا دن آ گیا!۔

بیگم صاحبہ نے شوہر کی خوشنودی کے لیے ایاز کا بچا کھچا سامان باغ والے کمرے سے منگوا لیا اور اس کمرے میں رکھ دیا۔ جو پہلے روز اسے دیا گیا تھا!۔ ہاجرہ نے اس روز کھانے میں کچھ اہتمام کیا تھا! اور سید صاحب بھی فجر کی نماز ادا کر کے تخت پر لیٹ گئے تھے۔!

عنبرینہ کے پرچے تو ہو چکے تھے۔ وہ یوں ہلکی پھلکی ہو رہی تھی جیسے منوں بوجھ کسی نے اس کے سر سے اتار لیا ہو!۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح گم صم اور محتاط تھی۔ انتظار کا کرب، وقت کے آہستہ آہستہ گزرنے کا احساس اسے سب سے زیادہ تھا۔ اندر اندر وہ پارے کی طرح بیکل تھی۔ لیکن اوپر سے مکمل ساکن اور پرسکون!۔

کیا وقت ہوا ہے؟ سید صاحب نے پوچھا۔

ابی جی ابھی تو صرف گیارہ ہی بجے ہیں، ہاجرہ نے جواب دیا۔ پھر وہ مسکرائیں وہ آئے گا ضرور۔ آپ تب تک ایک نیند لے لیجئے! میں سرہانے کا دروازہ کھول دوں؟"

کھول دو۔!" نقاہت بھری آواز میں کہہ کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ صنوبیہ ان کے پاس پڑی کرسی پر آبیٹھی اور خود کو بہلانے کے لیے پڑھا ہوا اخبار اٹھا کر پھر پڑھنے لگی!۔ ہر خفیف سے خفیف آہٹ پر وہ چونک پڑتی۔ پھر دل ڈوب جاتا اگر نہ آیا تو۔ اگر اس نے اپنی تو ہین بھلائی نہ ہو تو۔ پھر!!!۔

ڈاکٹر نے تھرمامیٹر جھٹک کر نلکی میں رکھا اور پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے بولا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ دراصل آجکل بہت سے لوگ لو لگنے سے بخار میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ احتیاط کیجئے لو کا حملہ سخت ہے مگر خطرناک نہیں سر پر مسلسل برف رکھتے جائیے! شام تک بخار میں تخفیف ہو جائے گی!۔

لیکن یہ بے ہوشی"۔ ایاز پر ایک فکر مند اور پر تشویش نظر ڈال کر شکیب نے کہا "یہ تو کوئی خطرناک بات نہیں ہے!۔

بخار کی حدت اور تکلیف نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے"۔ ڈاکٹر اُٹھ کھڑا ہوا "میں نے انجکشن دے دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہوش

آجائے گا۔ اگر کوئی بات اور پریشانی کی ہو تو آپ مجھے پھر بلا لیجئے گا!۔

اچھا میں چلتا ہوں"

ظہیر اس کا بیگ لیے پیچھے پیچھے چلا گیا!۔

ٹھنڈے نیم تاریک پرسکون کمرے میں ادھر ادھر سب لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ شکیب اس کی امی، والد اور بہن بھائی، حتیٰ کہ ایک طرف حصیر پر میرن خالہ بھی بیٹھی چکر مکر سب کو دیکھ رہی تھیں۔ مکمل بڑھاپے نے انھیں سن سفید کر دیا تھا۔ بڑی دلسوزی سے ایاز کو دیکھے جا رہی تھیں اور یوں پچھتا رہی تھیں جیسے اس کی یہ بیماری اور تکلیف انہی کی دین ہو!۔

چار روز قبل امتحان میں گیپ ہونے کی وجہ سے ایاز نے سوچا کہ پڑھنا پڑھانا تو کچھ تھا نہیں۔ کیوں نہ ایک مختصر سا سفر کر کے تھوڑی سی کامیابی کو منزل اختتام تک پہنچا کر اسرار و رموز کا پورا نقاب چاک کر دیا جائے!۔ اُسے بے قراری تھی۔ اس نے شکیب کو بھی سکون کی سانس نہ لینے دی۔ ہزار وہ کہتا رہا کہ چھری تلے دم تو لو۔ ایک ہفتہ بعد سہی میرن خالہ کہیں بھاگی نہیں جائیں! لیکن ایاز نے اس کی سُنی نہیں۔ وہ تیار تھا کہ تنہا چلا جائے گا! مجبوراً شکیب نے بھی ساتھ دے دیا! بخیر و عافیت وہ ایک گھنٹے میں منزل مقصود تک پہونچ گئے تھے۔ اور پھر اسٹیشن سے ٹیکسی کر کے گوڈال چلے گئے۔

شکیب اکتایا ہوا بے زار۔ اور قدرے چڑچڑا ہو رہا تھا۔ بولا "خدا تمھاری ان میرن خالہ کی عمر اور دراز کرے۔ قیامت کی گٹھری بٹوریں۔ اگر تمھاری ذات سے کوئی نگوڑ مارا راز چپکا ہوا بھی تھا تو منہ سے

کیوں نہ پھوٹ دیا۔ دل چاہ رہا ہے کہ سڑی بڑھیا کو پکڑ کے جوب ماردوں۔؟"

بس اب جو کچھ بھی ہے وہ راز اچھا یا برا سامنے آجائے گا!۔ ایاز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "تم راز کا لفظ کہتے ہو تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ یہ معلوم ہو گیا کہ میں بھی کسی شوقین امیر زادے کی خوش فعلیوں کا نتیجہ ہوں اور اب میرے نام نہاد ماں باپ کا دین دنیا میں پتہ نہیں ہے تو شکیب میں بخدا دنیا والوں سے منہ چھپا لوں گا۔ چل دوں گا کہیں اور۔ او ماگر۔

اور اگر کوئی دل خوش کن بات سامنے آئے تو پھر" شکیب نے بات اچک لی "مگر میاں میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ۔ میرن خالہ جان نے کچھ کہا بھی تو اس کی تصدیق کا ذریعہ تمہارے پاس کیا ہو گا؟ جو کچھ وہ کہیں گی جھوٹ کہ سچ۔ کیا تم وہ مان لوگے!۔

یہ تم نے نئی بات پیدا کر دی" الجھ کر ایاز بولا "یہ تو واقعی میں نے سوچا ہی نہ تھا کہ وہ جو کچھ کہیں گی۔ سچ ہی ہو گا۔ پھر اب کیا کروں میرن خالہ کا پتہ اتنی مشکل سے معلوم کیا ہے۔ یہاں تک آ بھی گئے ہیں تو کیا اب چلیں واپس۔ سوچ لیں کہ ایک ناجائز شخصیت کے مزید کیڑے چننے لا حاصل ہیں۔ اُف نوہ۔ میرے سر میں اتنا درد ہو رہا ہے کہ جیسے کنپٹیاں چٹخ رہی ہیں۔ آنکھیں الگ آگ بن رہی ہیں!۔ خدا غارت کرے یہ میں کون سی الجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں"

اب کیوں حوصلہ ہارتے ہو؟" شکیب نے کہا "اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی اچھائی پنہاں ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوڑ

دھوپ میں تمھاری بھلائی پوشیدہ ہو۔ دل مضبوط کرو۔ انشاءاللہ سب اچھا ہی اچھا ہوگا!"

"اب جو کچھ بھی ہو" جلتی ہوئی آنکھیں پھاڑتے ہوئے ایاز نے کہا: "اس سفر کے اختتام پر ہی میری آئندہ زندگی کا انحصار ہے۔ یا ادھر... یا ادھر"

"کیا مطلب؟" شکیب نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ اپنی پیشانی پر کوئی کلنک لیے جینا میرے لیے دشوار ہوگا" ایاز بولا: "خدا کی قسم میں خودکشی کر لوں گا!"

"ایاز!" شکیب چلایا: "سوچے سمجھے بغیر کوئی بڑی قسم کیوں کھاتے ہو"

"بہت سوچ چکا ہوں۔ بھائی۔ بہت سوچ چکا ہوں" ایاز نے گلوگرفتہ آواز میں کہا: "اب سوچنے کے لیے میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا!"

"میرے بھائی۔ تم کوئی انتہائی قدم اٹھا لوگے تو پھر میں کیسے زندہ رہوں گا" شکیب بولا: "اور کیا تم یہ سمجھتے بھی ہو کہ میں تمھیں کوئی ناگوار کام کرنے دوں گا"

"دیکھا جائے گا شکیب۔ پیش از مرگ واویلا کیا"

"صاحب، یہ بستی شروع ہو رہی ہے" ٹیکسی ڈرائیور نے دخل دیا "اب کدھر چلنا ہے؟"

"بھائی اتنی تکلیف اور کرو کہ یہاں کسی سے سکندر خاں نامی صاحب کا پتہ دریافت کرو" شکیب نے کہا: "تم اسی قصبہ کے ہو۔ یہاں کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہوگے؟"

"ہاں صاحب۔ سکندر خاں ایک آدمی اس بستی کا ہے تو سہی۔ مگر اس کی ٹیکسی سائیکلوں کی دوکان ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ وہ کھیت باغات کا آدمی ہے۔" ڈرائیور بولا۔

"دیکھیں! شاید وہی ہو یا وہ کچھ نشاندہی کر سکے!" شکیب نے کہا۔ ایاز اپنے خیالوں گم چپ چاپ بیٹھا تھا! ٹیکسی تھوڑی دور چلکر ایک ٹوٹی سی سائیکلوں کی دوکان پر رک گئی۔ ایک پہلوان سا لحیم شحیم آدمی اوپری بدن سے برہنہ میلا سا تہبند باندھے ڈھابلی کے نیچے بیٹھا ایک سائیکل کی مرمت میں مصروف تھا۔ اس نے سر اٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا!۔ اور ہاتھ سے اوزار رکھ دیا۔ پھر بھوبھو کی سی موٹی بھاری آواز میں بولا۔

"یہاں فقط سائیکلوں کی درستگی ہوتی ہے صاحب۔ موٹروں کی ورکشاپ ذرا آگے ہے!"

"ہمیں آپ سے کچھ پوچھنا ہے بھائی۔!" شکیب نے بڑی عاجزی اور انکساری سے کہا۔ "اگر آپ ذرا باہر آ سکیں تو۔!"

دیو قامت جوان ہنکارا بھر کر اٹھا اور کار کے پاس آکھڑا ہوا۔

"کیا پوچھنا ہے۔" وہ جیسے غرایا تھا۔

"آپ کا نام سکندر خاں ہے؟" شکیب نے کہا۔

"تو پھر۔!"

"آپ ناحق بگڑے جا رہے ہیں۔ سکندر خاں صاحب۔" شکیب نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتے ہوئے پھر لہجہ نرم اختیار کر لیا۔ "ہم ایک نہایت ضروری کام کے سلسلے میں حیدرآباد سے یہاں تک آئے ہیں۔ ہمیں میرن بی صاحبہ نامی ایک خاتون کی تلاش

بے ادب؟

بھلے آدمی پہلے ہی نہ کہہ دیا۔" سکندر خاں نے منہ پھاڑ کر اور حلق کی گہرائی سے قہقہہ آزاد کیا "ادے۔ میرا کل منجھ جان کے دلال سے جھگڑا ہو گیا تھا نا تو میں یہ سمجھا کہ اسی کے آدمی ہیں۔ واہ۔ ہا ہا۔ اچھا۔ ہاں بھاں کو آپ لوگ کیوں تلاش کر رہے ہیں۔!"

آپ ہی کی والدہ ہیں؟" فرط مسرت سے بدحواس ہو کر شکیب نے کہا۔

"ہاں۔!" اب وہ خلیق اور نرم بن گیا تھا "میری ہی والدہ ہیں آج کل کچھ بیمار ہیں۔ چلنا پھرنا مشکل ہو رہا ہے۔ آپ کو ان سے کیا کام ہے۔؟"

ایاز کا چہرہ گوناگوں احساسات سے کبھی سفید ہو رہا تھا کبھی سرخ اسے امید نہ تھی کہ اس قدر جلد کامیابی اس کے قدم چومے گی۔

اور وہ یہ سوچ کر بھی بدحواس ہوا جا رہا تھا کہ اگر میرن بی کے ذریعہ کوئی ناپاک راز طشت از بام ہو گیا تو پھر کیا ہو گا۔ وہ اپنے اچھے یا برے ماضی کو کیوں کرید رہا تھا؟ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے سر تھام کر پشت گاہ سے ٹیک لگائی۔ اور سنا بھی نہیں کہ شکیب کیا گفتگو کر رہا تھا۔

دفعتہً اس نے اپنے جلتے ہوئے گالوں کو دو نرم اور ٹھنڈے ہاتھوں کے درمیان محسوس کر کے آنکھیں کھولیں۔ اس کا چہرہ میرن خالہ کے مرتعش اور میر دہاتھوں میں تھا۔ جانے وہ بے چین ہو کر کب اس کے قریب آ بیٹھی تھیں۔ کب شکیب نے ان سے ایک "جوان ایاز"

کا تعارف کرایا تھا وہ تو بچہ ایاز کو چھوڑ آئی تھیں۔ اور کسی طرح باور نہ کر رہی تھیں کہ نوجوان جو ان کے پاس بیٹھا تھا وہی ایاز تھا! تھوڑی دیر وہ فرط مسرت سے روتی رہیں۔ پھر بڑی محبت سے ایاز کے چہرے کے بوسے لیے اور اسے کمزور ہاتھوں میں لے کر اپنے بوڑھے سینے سے لگا لیا۔ ایاز ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا تھا وہ بھی عجیب سے محسوسات میں گھر کر رہ گیا تھا۔ خوشی، فکر، تشویش، افشائے راز اب کیا ہونے والا ہے۔ اب کیا ہوگا!۔

پھر دفعتاً وہ گاڑی گول گول گھومنے لگی جس میں وہ بیٹھا تھا۔ آس پاس نظر آتے ہوئے چہرے گہرے اندھیرے میں ڈوبنے لگے! ایک عجیب سی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے کیا ہو رہا ہے۔ اماں۔ شکیب!" اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ شکیب بوکھلا گیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ناقابل فہم اظہار چچیوں نے ایاز کی یہ حالت کر دی تھی۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری! وہ اسی ٹیکسی پر واپس ہونا چاہتا تھا مگر اب بھلا میرن خالہ اپنے در سے بیمار بچے کو کیسے جانے دیتیں۔ وہ اور سکندر خاں ایاز کو اپنے گھر اتار لے گئے! ٹیکسی واپس کر دی گئی۔ سکندر خاں کے کسی آدمی نے ڈاکٹر تک دوڑ لگائی۔ اور کامل دو تین دن تک ایاز بخار میں پھنکتا رہا۔ قصبہ کے ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اسے سن مفرد کی ہو گیا تھا وہ اپنا علاج کر رہا تھا۔ مگر صورت حال پریشان کن ہوتی رہی۔ اب تو شکیب کے چھکے چھوٹنے لگے!۔ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہی تدبیر آئی تھی کہ وہ ایاز کو جلد از جلد شہر واپس لے جائے۔ میرن بی اور

سکندر خاں نے تیمار داری کا حق ادا کر دیا تھا۔ سکندر خاں برابر شکیب کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ میرن خالہ راتوں کو ساتھ جاگتی تھیں۔ لیکن جب کسی تدبیر سے ایاز کا مزاج درست نہ ہوا تو وہ بے چاری بھی پریشان ہو گئیں۔ پھر انھوں نے بھی یہی رائے دی کہ ٹیکسی کے ذریعہ اسے حیدر آباد لے جایا جائے۔!"

سکندر خاں نے ٹیکسی فراہم کردی تھی۔ اور بڑے اخلاق سے انھیں رخصت کیا تھا۔ ایاز کو وہ ایک لاش کی طرح پچھلی سیٹ پر ڈال کر لائے تھے۔

میرن خالہ ساتھ آئی تھیں۔ راستے میں ایک دو مرتبہ وہ خود سے بڑبڑا کر بولی تھیں۔

"میری عقل پر پتھر پڑیں۔ یہ پرانا واقعہ میں بھول ہی گئی تھی۔ مجھے صاحب نے کہا بھی تھا کہ میرن بی ایک چکر شہر کا لگا دیئے گا۔ میں بولی تھی کہ اچھا صاحب زندگی حیات ہے تو آؤں گی پر دن گذرتے چلے گئے یہاں جائداد کھیت باڑی کے بٹوارے شروع ہو گئے۔ دھیان سے بات اتر گئی۔ نہیں تو۔ بے چارے بچے کو ایسا حیران پریشان کاہے کو ہونا پڑتا!"

کیا واقعی اس کی زندگی سے کوئی ایسا بھیانک راز وابستہ ہے جسے آپ نے ظاہر کرنا پسند نہ کیا تھا۔ ڈرتا ڈرتا شکیب بولا۔ جانے وہ کیا کہہ دیں جو وہ خود بھی برداشت نہ کر سکے!۔ مگر ایک گہری آہ بھر کر میرن خالہ نے کہا تھا۔

خاندانوں کی آپس کی دشمنی کی کہانی ہے بیٹا۔ جب سگے بھائی دشمن

بن جاتے ہیں تو کتنے یکیلے ہو جاتے ہیں کہ بس میرے پروردگار کی چاہ!"

ایاز کو بڑی پریشانی تھی کہ جانے اس کے ماں باپ۔!"

بیٹا پریشانی کی بات تو ہے ہی۔! وہ قناعت سے بولیں اور پھر نہ ثکیب نے کچھ پوچھا نہ میرن بی بی نے کہا۔ باقی راستہ خاموشی سے کٹ گیا!۔

اور آج چوتھا دن تھا کہ ایاز پر بدستور نیم بے ہوشی طاری تھی۔ کبھی اسے ہوش آجاتا اور وہ ہذیان سا بک کر پھر غافل ہو جاتا۔ سرسامی حالت میں ثکیب اس کے سر پر آئس بیگ رکھے بیٹھا رہتا! ثکیب کے والد کبھی ملٹری کرنل رہ چکے تھے وہ اپنا علاج بھی کر رہے تھے!۔ دوسرے ڈاکٹروں سے مشورے بھی کرتے تھے!۔ چوتھے دن کی سہ پہر کو جب موسم اتنا قہر سامان نہ رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بھورے بادل اکٹھا ہو رہے تھے۔ پانی کی مہک سے لبریز خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایاز کا بخار کافی حد تک اتر گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں!۔ چند لمحے مبہوت بنا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس کے حواس عود کر آئے۔ اور اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس پر تقریباً سب ہی امڈے ہوئے تھے!۔

ہیلو۔ کامریڈ۔! ثکیب کے والد نے ہنس کر اس کے گال پر تھپکی دی۔ اور انگریزی میں بولے:" اب اٹھ بیٹھو۔ تم ایسے نوجوان اتنے دن بستر پر نہیں لیٹے رہا کرتے۔ خود کو اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟

جواب میں وہ بولا:" مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ چچا جان! کیا میں گھر پر ہوں۔ مجھے یہاں کون لایا۔ کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا۔!"

رحمان صاحب ہنس پڑے: "ہاں بھئی۔ انھیں کچھ کھانے کو دو۔ حوری دلیہ تیار ہو تو فوراً لے آؤ!"

کھا پی کر اس میں کچھ طاقت آئی۔ آنکھیں کھلیں اور حواس درست ہوئے۔!

اے بیٹا بڑا پریشان کیا تم نے۔" حوری کی امی نے کہا۔ "میں ذرا چلوں عصر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ حوری بیٹی۔ شریف کو پیسے دے کے ایک سیر مٹھائی منگوا لو۔ منت مانی تھی میں نے۔ نیاز دلواؤں گی۔

جب بڑے لوگ ادھر ادھر ہو گئے تو ایاز نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ شکیب کیا اگلے پرچے یونہی رہ گئے۔ میرے خبط نے تمھارا سال بھی خراب کر دیا۔ ہائے۔ میں کتنا تباہ کن دوست ہوں!"

تم صحت مند ہو جاؤ بس، میرے لیے یہی سب سے بڑی کامیابی اور خوشی ہے" شکیب نے کہا وہ جھلملاتی آنکھوں سے مسکرا رہا تھا: امتحان اگلے سال ہم تم مل کر پھر دے لیں گے۔ اب ذرا چاق ہو کر بیٹھو۔ سچ کہتا ہوں کہ تم تو خیر بے ہوش تھے مزے میں تھے مگر میں نامراد نگوڑا ہوش میں تھا۔ بہت بد مزہ تھا۔ ایک ایک لمحہ سولی پر کٹ رہا تھا!۔

الحمد للہ تم ٹھیک ہو گئے ہو۔ جان میں جان آئی ہے اور وہ جو غالباً کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی

ہم بیابان میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔" واللہ تم بڑے خوش قسمت ہو۔ ہم بیابان میں تھے اور اماں کہتی ہیں کہ ہمارے ہاں قریب قریب روز بہار آ کے جاتی تھی!"

ایاز ہنس رہا تھا "جاتی کیوں تھی۔ یہیں رہ پڑتی۔!"

واہ۔ جوان جہان بہار برائے گھر کیسے رہ پڑتی" شکیب نے آنکھیں پھیلا کے کہا "تمہارے لیے آتی تھی۔ اب پھر آئے گی۔! اللہ رکھے اس کا گھر بار ہو جائے گا تو سسرال سمجھ کے رہ بھی پڑے گی۔ اے ہاں یاد رکیا۔"

اماں کی نقل چھوڑو۔ سچ سچ بتاؤ۔ کیا کہہ رہے ہو" ایاز بولا۔

"ارے بیٹا وہ تمہاری بھولی بے چاری۔ تمہارے فراق میں روز غریب کے در کے پھیرے کرتی تھی۔ پوچھ لو حورا سے" شکیب نے بتایا "کہہ رہی تھی کہ سید صاحب قبلہ بھی کچھ بیمار ہیں۔ اختلاج کے دورے پڑ رہے ہیں اور تمہارے فراق میں بے چین ہو رہے ہیں۔ اور روز صنوبیہ کو بھیج رہے ہیں اور۔۔"

بس کرو یہ اور، اور" ایاز نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا "کیا تم سچ کہہ رہے ہو!"

"تو! تمہارے لیے جھوٹ بول کر میں کیوں اپنی آخرت خراب کروں گا" شکیب نے کہا "ممکن ہے کہ آج بھی آئے۔ اطمینان رکھو۔ میں یہاں سے ہٹ جاؤں گا۔ بھائی کچھ تم اس سے مل کے بھوں بھوں کرو گے۔ کچھ وہ تمہارے گلے لگ کر ٹسوے بہائے گی۔ میں ایسے دردناک منظر نہیں دیکھ سکتا تم لوگ رو چکنا تو آواز دے لینا۔ رومال لے کر آجاؤں گا!"

"شکیب! اگر سچ مچ سید صاحب کی طبیعت خراب ہے تو مجھے جانا چاہیئے" ایاز نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ اختلاج کے دورے انھیں خطرناک پڑتے ہیں۔"

"ارے ابھی صبح تک ہذیان سرائی فرما رہے تھے" شکیب نے

ڈانٹا: اللہ اللہ کر کے خدا کے گھر سے پلٹے ہو۔ نا بیوی نا۔ میں اپنے کمزور بچے کو توانسی دور جانے نہ دوں گا!۔ اور پھر، بیٹا بھول گئے اپنی انسلٹ۔ لاحول ولا قوۃ!"

انھوں نے کیا کیا تھا۔ انھیں تو خبر بھی نہیں تھی۔ میں چلا آیا تھا" ایاز نے کہا۔

"اچھا کیا تھا" شکیب نے جھلا کر جواب دیا۔ اب سید صاحب اچھے ہوں گے۔ فکر نہ کرنے میں تو تمھیں جانے نہ دوں گا ۔ ابھی تم صحت مند نہیں ہوے!۔

بھائی جان؟" حوری نے پردے سے سر نکال کر کہا۔

دونوں ادھر متوجہ ہو گئے۔!"

سید چچا کے ہاں سے ملازم غفور آیا ہے" حوری بولی" دریافت کر رہا ہے کہ ایاز بھائی آئے کہ نہیں۔ آئے ہوں تو فوراً ان کے پاس پہونچیں۔ ان کا جی اچھا نہیں ہے۔ بتائیے میں کیا جواب دوں!۔ وہ باہر منتظر کھڑا ہے!"

شکیب!۔ خدا کے واسطے!" ایاز تڑپ کر بولا۔

شٹ اپ!" شکیب بولا۔ خاموش لیٹے رہو۔ جان سے مار ڈالوں گا اگر بستر سے ہلے بھی۔ میں اسے جواب دیے آتا ہوں۔!"

شکیب! میرے بھیا۔ سنو تو!" ایاز کہتا ہی رہ گیا۔ مگر شکیب دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔

حوری جو کمرہ میں رہ گئی تھی۔ منھ دبا کر ہنسنے لگی!۔

حوری۔ کیا سچ مچ یہاں صنوبیہ آتی تھیں" ایاز نے بے چین ہو کر کہا۔ حوری

مسکرائی " جی ہاں ۔ ان تین دنوں میں تو برابر آتی رہی ہیں۔ آپ کی وجہ سے بہت پریشان تھیں ۔ آپ کو نہیں معلوم، ارقم اور جبیر کی چوری کھل گئی تھی ۔ سید صاحب نے انھیں گھر سے نکال دیا۔

میں نہیں سمجھا کیا ہوا تھا ۔ پوری بات کہو " وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور حوری نے کم سے کم لفظوں میں اسے بتایا کہ صرف اسی کا راستہ سیدھا کرنے کے لیے ارقم اور جبیر نے صنوبر سے مل کر سازش کی تھی۔ اسے چور ٹھہرایا اور صنوبر کو اس کے کمرے میں بھیج کر اسے گناہ گار ثابت کرنا چاہا تھا۔ مگر چونکہ ارقم نے صنوبر کو مطلوبہ رقم نہ دی تھی۔ لہذا خفا ہو کر اس نے سب کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

ایاز نے حیرت سے یہ واقعات سنے پھر بولا " ارے مجھ کو راہ سے ہٹانے کے لیے جبیر و ارقم نے برائی کیوں مول لی۔ میں تو سید صاحب کا ملازم ان کا پروردہ ہوں ۔ مجھ سے وہ کہتے میں یونہی چلا جاتا ۔"

" بس یہی تو آپ کی سادگی ہے جو دوسرے آپ پر چھا جاتے ہیں"

حوری بگڑ کر بولی۔

شکیب اندر آیا " میں مطمئن کر آیا ہوں ، کہہ دیا ہے کہ ابھی تم کمزور ہو رہے ہو ۔ تین چار دن بعد ان کے حضور میں باریاب ہو سکو گے اب آرام کرو سمجھے ۔!"

میرن خالہ کہاں ہیں ؟ چپکے سے ایاز نے پوچھا ۔

سچ مچ تم نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے ۔ میرن خالہ، میرن خالہ اگر ان کی عمر بارہ سال کی ہوتی تو تمھارا نکاح ان سے کر دیتا ۔" شکیب جھنجلا

کہ بولا۔ ایاز چپ ہو گیا اور حوری ہنس پڑی۔

اسی رات کی بات تھی کہ سب کھانے سے فارغ ہو کر اطمینان سے باتیں کر رہے تھے۔ ایاز اب ٹھیک تھا۔ اس قابل تھا کہ ان سب کے ساتھ بیٹھ سکے! شکیب کے والد رحمان صاحب اپنے زمانہ ملازمت کے دلچسپ قصے سنا رہے تھے۔ موسم نہایت اچھا ہو گیا تھا۔ بعد مغرب اچانک قبلہ سے گھٹا اٹھی تھی اور دو گھنٹے تک گرج چمک کے ساتھ زوردار بارش ہوئی تھی۔ جس نے موسم یک لخت بدل دیا تھا۔ اب بھی فرحت افزا ہوائیں ارغنوں بجاتی چل رہی تھیں۔ کبھی زوردار جھونکا آتا تو درخت زمین بوس ہو کر سیدھے ہوتے اور پتوں میں چھپے موتی جھر جھر برس جاتے!"

"ڈیڈی۔ وہ قصہ سنایئے جب آپ نے اس جٹا دھاری جوگی کو پکڑا تھا جس نے چالیس بچوں کے کلیجے کھائے تھے!" حوری نے یاد دلایا۔

"ارے اب بس کرو۔ ایاز کو سونے دو!" اماں نے کہا۔

دفعتہً وہاں ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ اور ہانپتا ہوا بولا: "صاحب اپنے ہاں جانے کون کون لوگ آئے ہیں۔ آٹو رکشوں سے اتر رہے ہیں"۔

"کہیں آپ کی ہمشیرہ معظمہ اپنی فوج سمیت تشریف نہ لائی ہوں"۔ رحمان صاحب نے بیوی سے کہا۔ اتنے میں شکیب اور ظہیر جو ملازم کے ساتھ باہر بھاگے تھے وہ معہ بیگم سیٹھ صاحب، ہاجرہ، عمرانہ اور صنوبیہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔

رحمان صاحب حیرت کا ایک نعرہ لگا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سید صاحب سے مصافحہ کرنے لگے۔ سب ہی تعجب اور خوشی کے مارے گڑ بڑا کر کھڑے ہو گئے تھے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا گفتگو کریں۔ ہاں تو بوکھلاہٹ کے مارے رسمیات ہی کا ہوش نہ تھا! بہر حال شکیب ہی نے حواس قائم رکھ کے سب کو یہاں وہاں بٹھایا۔ اور سید صاحب کو آرام سے ایک دیوان پر لٹا دیا۔

قبلہ آپ نے بڑی زحمت کی۔ ! رحمان صاحب نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے چہرے پر تھکن کے آثار ہیں۔

بھائی صاحب۔ ایاز میاں کے آنے کی خبر سن کر دل نہ مانا۔ سید صاحب نے جواب دیا: میں تو سہ پہر ہی کو انھیں دیکھنے کے لیے آنے والا تھا۔ یہ سب بھی تیار ہی تھے۔ کہہ رہے تھے کہ اگر ایاز آنا پسند نہ کرتے ہوں تو ہم ہی سب مل کے چلیں گے مگر غیر متوقع طور پر بارش نے آلیا۔ مجبوراً اب تکلیف دی ہے۔! ایاز کو دیکھ لیا۔ اطمینان ہو گیا حوری! بیٹی۔ چائے پلا دو تو پھر چلیں۔!"

حوری ہنستی ہوئی بھاگی۔ اس کے پیچھے صنوبیہ بھی چل دی۔ رحمان صاحب نے مضبوط لہجہ میں کہا: اب کہاں آپ جانے پائیں گے۔ سید بھائی، خدا کی قسم۔ میں جانے نہ دوں گا۔ آپ نے یا بھابی محترمہ نے چوں چرا کی تو یہ سمجھیے کہ آئندہ کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے رات کا کھانا نہ کھایا ہو تو میں ابھی فوراً تیار کرواتا ہوں۔ پھر یہیں آرام فرمایئے۔ صبح ناشتے کے بعد دیکھا جائے گا!"

دیکھا جائے گا؟" بیگم ہنس کر بولیں۔ "مطلب یہ کہ تب بھی آپ

کی نیت صاف نہ ہو گی!۔

بھابی جان۔ اب سب کے سامنے کیا عرض کروں۔ نیت تو میری کبھی صاف نہ تھی!" رحمان صاحب نے کہا۔ بیگم صاحبہ اس عمر میں شرما گئیں اے رحمان بھائی۔ بڑھاپے میں آپ کو چونچلے خوب سوجھتے ہیں!"

حوری چائے لائی۔ اور بولی: "میں اور صنوبیہ کھانا تیار کر رہے ہیں!"

تبھی ایک کونے سے میرن خالہ نمودار ہوئیں اور سید صاحب کے سامنے جا کر جھک کے بولیں: "بڑے صاحب۔ سلام۔ کیسا مجاز ہے" مزاج کا کیا ہے میرن بی صاحبہ" سید صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے ہماری خبر ہی نہ لی۔ بتائیے تو آپ آخر کہاں جا کے چھپی تھیں؟"۔

شکیب ایاز کے کان میں گنگنایا۔ "میاں۔ پرانی محبت۔ تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا۔ کس کا مصرعہ ہے۔" ایاز نے اس کے چٹکی لی۔ "چپ رہو۔!"

میرن بی فراخدلی سے ہنس دیں۔ اور اپنی داستان سنانے لگیں۔ سید صاحب کی بیوی، اور ہاجرہ وغیرہ اٹھ کر ایاز کے پاس آ بیٹھیں۔ وہ سخت شرمندہ ہو رہا تھا!۔

صنوبیہ اور حوری بڑی جلدی پراٹھے، آملیٹ، مونگ کی بھونی دال پکا لائیں۔ سید صاحب اور بیگم صاحبہ کو سب نے اصرار سے کھلایا پھر بڑے مزے کی نشست جم گئی!۔

آغاز سید صاحب کی بیوی نے کیا تھا۔ بولیں: "میرن بی۔ اب تم پچ پچ بتاؤ کہ آخر یہ معاملہ نگوڑا ہے کیا۔ ساری عمر بے چارہ لڑکا پریشان رہا ہے۔ تم تو یہاں سے اڑنچھو ہوئیں اور جیسے ہمیں بھول ہی گئیں۔

آج تم کو کہنا ہے کہ ایاز آخر کس کا لڑکا ہے !"

"اے بیگم صاحب - بڑے گھرانے کا ہے - واہ" بیرن بی نے کراری آواز میں جواب دیا - پھر ان کی آواز یک لخت مُردہ ہونے لگی " صاحب یہ آپس کی دشمنیوں کی بات ہے - سگے بھائیوں میں نوج ایسی بات ہو - توبہ اللہ صاحب کے آگے ! - آج سے کوئی تیس سال پہلے میں حکیم جی میاں کے ہاں کام پر نوکر تھی - کیا اچھے لوگ تھے ان کے - جنت نصیب ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھے - شروع شروع میں سب لوگ ایک جگہ مل کے رہتے تھے - حکیم جی میاں نظام سرکار کے خاص طبیب تھے بہتیرا کمایا - بہتیرا جمع جوڑ کیا تھا - کئی گھر تھے کئی باغ تھے - نقد روپیہ تھا - بیٹیوں کی شادی ان کی زندگی میں ہوگئی تھی وہ بھی اپنے گھر سے سُکھی نہال تھیں - حکیم جی کی زندگی تک کسی میں کوئی اختلاف، کوئی رنجش نہ ہوئی تھی - مگر ان کے مرنے کے بعد نجانے شیطان نے کیا شہد کی انگلی لگا دی کہ بھائیوں میں روز روز کے جھگڑے رہنے لگے ! اُتنا ہے کہ ایک بڑی جائیداد تھی - اس زمانے میں لاکھوں کی مالیت کی اس کے بارے میں کوئی چھ سات سال، یا زیادہ مدت تک مقدمہ چلتا رہا - اور کسی طرح فیصلہ ہونے کو نہ آیا - !

حکیم جی میاں ؟ " دفعتہً ہاجرہ نے کہا " یہ نام اور قصہ سنا ہوا سا لگتا ہے - اب یاد آ رہا ہے مجھے - سسرال میں میری بڑی نند اکثر اپنے کسی نند کی غیر معمولی امارت کا تذکرہ کرتی رہتی تھیں - !!

ہوگا بیٹی - اکثر پرانی رشتہ داریاں بہت بعد کو جا کے نکل آتی ہیں"

شکیب کی امی نے کہا "

تو بیوی جی۔ پھر ہوا یہ کہ دونوں بھائی مقدمہ لڑتے رہے اور ان کی دشمنی بڑھتی رہی۔ میری خالہ پھر شروع ہوگئیں۔ ان کی بیویوں میں بھی بڑی دشمنی تھی۔ پہلے جو سگی بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ اب ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوگئیں، توبہ۔ پیسہ نامراد کیا بد بلا ہے۔ سنا ہے کہ جائیداد کے اس بکھیڑے میں چھوٹے بھائی حق پر تھے۔ مگر ان کا ساتھ کسی نے نہ دیا۔ چونکہ بڑے بھائی سے مٹھی گرم ہونے کی توقع سب کو تھی۔ لہذا سب اُنہی کی گانے بھئے۔ مگر اللہ کی کرنی اور تھی۔ چھ سات سال بعد مقدمہ کا فیصلہ چھوٹے بھائی کے حق میں ہوگیا!۔

دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ سید صاحب کی بیگم نے کہا۔

"اب قصہ یہاں سے سنیے کہ جیسے ہی چھوٹے بھائی فراست میاں کے حق میں فیصلہ ہوا اور وہ جائیداد جیت گئے تو بڑے بھائی شجاعت حسین جو ان کے خون کے پیاسے تھے ساری دشمنی بھول کے چھوٹے بھائی سے پھر مل گئے۔ پھر سے بیویوں کا آپس میں ملنا جلنا شروع ہوگیا۔ پھر سے آپس میں تحفے ہدیے دیے جانے لگے۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے یہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے دشمن تھے کہ صبح صبح آپس میں صورتیں تک دیکھنا گوارہ نہ کرتے تھے۔ میں تو یہی کہوں گی بیگم صاحب کہ فراست میاں۔ فقط نام کے فراست میاں تھے عقل اور سمجھ بوجھ دنیاداری ان میں نہ تھی۔ بے چارے شجاعت میاں کے چھل فریب میں آگئے۔ شجاعت میاں کی ریاکاری کو خلوص پیار سمجھ بیٹھے تھے۔ اللہ صاحب۔ میں کیا عرض کروں آپ سے۔ فراست میاں کی اکلوتی بیٹی تھی ایک بچہ بی بی

بیچ بیچ جیسے تاروں سے گندھی تھی لڑکی۔ صورت کی اتنی بھولی اتنی خوبصورت اور عادتیں بھی حوروں کی سی۔ فراست میاں اسے دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ تھی بھی وہ بچی ایسی ہی۔ میں اسے بہت چاہتی تھی۔ اور وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتی تھی۔ کیونکہ مقدمہ کے دوران میں حکیم جی میاں کے گھر سے فراست میاں ہی کے پاس آکر رہ گئی تھی۔

نجمہ بی بی۔!" کچھ یاد کر کے ایاز نے شکیب کا ہاتھ دبایا۔

ہوں۔ ہوں۔!" وہ بولا۔ ہمہ تن گوش تھا۔

"جب آپس کی دشمنیاں پرانا قصہ ہو گئیں" بیرن خالہ کی تقریر میں جوش پیدا ہو رہا تھا۔ روانی زوروں پر تھی۔ "اور پھر سب ایک ہو گئے تو شجاعت میاں نے اپنے بیٹے مصطفےٰ احمد کا پیغام نجمہ بی بی کے لیے دیا! وہ پڑھے لکھے خوبصورت جوان تھے مگر باپ سے بے حد ڈرتے تھے۔ باپ اگر کہتے کہ بیٹا آنکھ بند کر کے کنویں میں کود جاؤ تو شاید انھیں عار نہ ہوتا! مجھے معلوم تھا کہ وہ نجمہ بی بی کو چاہتے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ نجمہ بی بی سے ان کا بیاہ ہوگا تو بہت خوش ہوئے تھے۔ آہ بڑے صاحب۔ شجاعت میاں نے بہتیرے معصوموں کا پاپ اپنی گردن پر لیا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ بہت بری طرح مرے۔ حلق میں سرطان ہو گیا تھا۔ کمر گر گئی تھی۔ اور نماز کے گھٹے میں کیڑے پڑ گئے تھے!"

ان اعمال پر نماز بھی پڑھتے تھے؟" شکیب نے کہا۔

"خاموش!" رحمان صاحب نے ڈانٹا۔

اچھا۔ پھر۔!" سید صاحب نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"پھر صاحب یہ ہوا کہ نجمہ بی بی کے ابا نے بھی بھتیجے کا پیغام منظور کر لیا"

میرن بی نے قصہ جاری رکھا۔ دونوں طرف دھوم کی تیاریاں ہوئیں اور آخر کھیلوں بھر جہیز کے ساتھ نجمہ بی بی، مصطفےٰ میاں سے بیاہ دی گئیں۔ ہائے۔ بیٹی کی رخصتی کے بعد کیسی بری طرحوں فراست میاں روئے ہیں کہ دیکھنے والے تک رو پڑے تھے۔ ان کی تو وہی ایک بیٹی تھی۔ روتے کیسے نہ۔ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد میرن بی نے اچانک روتے ہوئے کہا۔

"اے صاحب۔ آپ کو نہیں معلوم کہ شجاعت میاں نے چھوٹے بھائی سے کیسی خوفناک دشمنی کی تھی۔ ان سے کتنا بڑا بدلہ لیا تھا۔ بھائی کی بچی کو بیاہ کر لے گئے تھے۔ اور پھر۔ شادی کی دوسری صبح کو اپنے بیٹے پر بندوق تان کر کھڑے ہو گئے کہ ابھی اور اسی وقت نجمہ بی بی کو طلاق دے دیں۔"

"کیا؟ طلاق۔ بے وجہ" کئی ایک نے یکزبان ہو کر پوچھا۔

"بدلہ لینا تھا انھیں چھوٹے بھائی سے۔" میرن خالہ نے کہا۔ "لے لیا۔ اچھوتی لڑکی لے گئے تھے۔ ایک رات کی سہاگن بھتیجی کو دوپہر تک طلاق کر کے مع دان دہیز کے بھائی کے گھر بھجوا دیا۔ ا۔ ہا ہ۔ ہا ہ۔"

"پر ایسی بھی کیا بزدلی کہ مصطفےٰ صاحب نے اپنی من چاہی دلھن کو باپ کے کہے سے طلاق دے دی۔" دونوں بزرگ خواتین ہکا بکا تھیں

"اوے وہ بڑے ڈرپوک تھے۔" میرن بی نے کہا۔ "بڑے شریف تھے۔ اونچی آواز میں نہ بولتے تھے۔ بڑا بول منھ سے نہ نکالتے تھے باپ سے ڈرتے تھے۔ بس باپ نے چھاتی کی طرف بندوق تان کر

حکم دے دیا کہ دیدے طلاق۔ ورنہ یہ گولی تیرے اور میرے دونوں کے سینوں کے پار ہوگی۔! مصطفےٰ میاں سہم گئے جانتے تھے کہ باپ ایسے ہی جلاد تھے۔ بس بیوی کا منھ سے تین مرتبہ طلاق کے بول نکال دیے اور غش کھاکے گر گئے!"

کیا حال ہوا ہوگا بے چاری ایک رات کی بیاہی دلھن کا؟" رحمان صاحب نے لقمہ دیا۔

"آدھی زندہ آدھی مردہ میکے پہونچائی گئیں۔ کیا بتاؤں۔ اس بن ناحق کے ظلم پر گھر میں کیسا کہرام مچا تھا۔ دلھن بی پٹخنیاں کھا رہی تھیں۔ ادھر مصطفےٰ میاں عقل و ہوش سے بیگانہ دیوانہ بنے تھے۔ لوگ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ لوگ بات کا بتنگڑ بنا رہے تھے" میرن بی نے سلسلہ جاری رکھا "اور نجمہ بی بی کی حالت میں کیا بیان کروں۔ وہ تو پاگل ہو رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فقط دو آنکھوں سے کتنا روئیں۔ وہ تو سارے جسم سے رو رہی تھیں۔ اغریب، مظلوم بچی۔ سگے تایا نے بھتیجی سے انتقام لیا تھا۔ اسے داغدار کرکے باپ کے گھر پھنکوا دیا تھا۔

اللہ توبہ۔ موئے قصائی!" شکیب کی امی نے جھرجھری لی۔

"اب آگے قدرت کا ظلم سنئے بیوی تو۔ میرن بی نے ماتھا پیٹ کر کہا "دو تین مہینے نہ بیتے ہوں گے کہ نجمہ بی بی دوسرے حالوں ہو گئیں۔! ادھر ماں باپ چاہتے تھے کہ ان کا غم بھلانے کو دوسری شادی کردیں۔ ادھر یہ افتاد پڑ گئی۔ کیا کرتے کیا نہ کرتے۔ ان سب پر خواہ مخواہ آسمان اور زمین نے مل کر ستم ڈھایا تھا۔ ایک ایک لمحہ گزرنا محال۔ دلھن بی نے بہت چاہا کہ یہ بوجھ

ہلکا کردیں۔ مگر نجمہ بی بی جو پہلے ہی دھان پان تھیں، اب تو اور بھی ردی کا
پھوڑا ہو رہی تھیں۔ سارے ہی ڈاکٹروں اور ڈاکٹرنیوں نے کہہ دیا کہ
اگر بچہ ضائع کیا گیا تو ماں کی جان بھی جائے گی۔ اس لیے وہ جوں کا توں
بڑھنے دیا گیا۔ نجمہ بی بی کا کھانا کون۔ سارے دکھ درد بے چاری نجمہ ہی سے
کہتی تھیں۔ روتی تھیں۔ پچھاڑیں کھاتی تھیں۔ اپنے ایک ہی رات کے
شوہر سے انھیں بے حد محبت تھی! وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی نشانی ضائع
جائے! وہ بڑے جتن اور لگن سے اپنے بچے کے دنیا میں آنے کا انتظار کر
رہی تھیں۔ ایسے میں ایک ستم یہ ہوا کہ اچانک دلھن بی گزر گئیں۔ ان کی موت
تو سچ پوچھے بہانے سے ہوئی۔ نہا کر غسل خانے سے نکل رہی تھیں کہ چکنے پتھر پر
پاؤں پھسل گیا۔ اس طرح گریں کہ دل کی طرف نچلی چوکھٹ کا کنڈہ لگا! اور
بس بے چاری نے سر تک نہ اٹھایا۔ وہیں دم توڑ دیا۔! اللہ اللہ، فراست
میاں اور نجمہ بی بی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی! نجانے قہر پر قہر ان پر
کیوں برس رہا تھا۔ لاکھ کا گھر خاک ہو رہا تھا۔ سب کچھ تباہ برباد ہو رہا
تھا۔ مگر ہوش کسے تھا کہ آگے پیچھے کی خبر لیتے۔ ایسے میں اللہ پاک نے
میرے دل میں ان کی محبت اپنا ایمان ڈال دیا تھا۔ سارے سہارے
ان کے چھوٹ چکے تھے۔ میں نے نجمہ بی بی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اللہ کو مجھے بھی
جواب دینا ہے!"

"بے شک بے شک!" میر صاحب نے کہا۔

میرن بی نے پہلو بدلا۔ ایک ٹکڑہ پان مانگ کر منہ گرم کیا اور پھر
پرانی کہانی کے پیچ و خم میں گم ہو گئیں۔

فراست میاں پر بھائی کے ظلم و زیادتی اور بیوی کی موت، بیٹی کی

کسمپرسی کا ایسا گہرا اثر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہ گئے تھے۔ کبھی
بہکی بہکی باتیں کرتے۔ کبھی روتے کبھی بیوی کی قبر پر جا کے گھٹنوں کے
لیے بیٹھ جاتے۔ ان حالات میں بیوی میں اپنی دکھیاری نجمہ بی بی کی
اکیلی غم خوار تھی۔ اب ان کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اس لیے فراست میاں
نے ایک صاحب کا پتہ چلا ہی لیا جو نجمہ بی بی سے نکاح پر تیار تھے۔ لیکن
وہ جو دوجی سے تھیں۔ اس کی مشکل تھی۔ انتظار تھا تو بس اتنا کہ اللہ
انھیں ساتھ خیریت کے فارغ کر دے! ۔ نجمہ بی بی جو حالات کے سامنے
بہت ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں وہ بھی یہی چاہنے لگی تھیں کہ کسی کے سہارے
زندگی بسر کر لیں۔ پھر ایک رات انھوں نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ سچ کہتی ہوں
بیگم کہ کسی کو خبر تک نہ لگی۔ مصلحت بھی یہی تھی۔ کیونکہ ایک طلاقن ماں
کو کون قبولتا۔ بہر حال مشکل سے چلا گیا! اور ادھر ان بالسٹر صاحب
(بیرسٹر صاحب) نے جلدی کرنے کا تقاضہ کیا۔ ادھر فراست میاں جو
زندگی سے بیزار ہو چکے تھے۔ انھیں نکاح کے لیے کہہ دیا۔ دوسرے روز نکاح
تھا تب۔ نجمہ بی بی نے اپنا بچہ میری گود میں ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر
روتی ہوئی بولیں کہ میرن خالہ اب یہ تمھارا ہے۔ اسے لے جاؤ۔ پالو پوسو
مگر اسے کوئی تکلیف نہ دینا۔ کبھی ظاہر نہ کرنا کہ یہ کس کے کلیجے کا ٹکڑہ
ہے۔ کیونکہ ہونٹوں ہونٹوں بات بہت دور جائے گی اور میں بدنام
ہو جاؤں گی۔ شاید مجھے دوسرے گھر میں بھی چین سکون نہ مل سکے۔
ان کے اس طرح کلیجے کا خون بہانے دیکھ کر میرا کلیجہ بھی خون ہو گیا۔
میں نے ننھے سے لال کو سینے میں چھپا لیا۔ اور وعدہ کیا کہ اسے اپنا
سمجھ کے رکھوں گی۔ کبھی کسی کو معلوم نہ ہو گا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔

دوسرے روز نجمہ بی بی کا نکاح بالسٹر صاحب سے ہو گیا۔ اور یہ کہنا تو میں بھولی جا رہی تھی کہ اس سے تین چار مہینے پہلے فراست میاں نے اپنی ساری جاگیر جائیداد بیچ دی۔ لاکھوں نجمہ بی بی کو دیا اور انھوں نے اپنا حصّہ بارہ تیرہ لاکھ روپیہ اپنے بچے کے نام سے بینک میں رکھ کے کتابیں مجھے دے دیں۔ وہ میرے پاس ہیں۔ جب چاہیں لے لیں!"۔ ببرن بی نے ایک گہری سانس لی۔ "نجمہ بی بی کا تاکیدی کہنا تھا کہ جب تک بچہ پورے پچیس سال کا نہ ہو جائے یہ اسے دیا نہ جائے میں نے کہا کہ بی بی میں تب تک جیوں کہ نہ جیوں۔ موت کا کیا بھروسہ تب انھوں نے جواب دیا کہ۔ کوئی بات ایسی ہو جائے تو لڑکے ہی سے سب کچھ کہہ دیا جائے؟ مگر۔ !"

"مگر آپ نے اتنی لمبی نیند کیوں لی۔ یہ سب کچھ ہم سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا" سید صاحب نے کہا۔ وہ غور سے ایاز کو دیکھ رہے تھے جو مبہوت دم بخود اور سکتہ زدہ سا یہ عجیب سی کہانی سن رہا تھا۔

"میں نجمہ بی بی کی بڑی بڑی قسمیں کیسے توڑ دیتی۔ صاحب!۔ انھوں نے نہ صرف اپنی جان کی زندگی کی قسم دی تھی بلکہ دو ماہ کے ننھے سے بچے کو میری گود میں دے کر کہا تھا یہ میری آبرو کی صورت میں تمھاری گود میں ہے۔ اس بچے کی جان کی قسم یہ کہانی عام نہ کرنا۔ ہو سکتا ہے کسی کو معلوم ہو جائے اور میں جو آن اور لاج پر جان دیتی ہوں۔ بس سب میں شرمندہ اور خفیف ہوں۔ سو بڑے صاحب۔ میں بچے کی جان کی قسم کیسے توڑ دیتی؟"۔ انھوں نے تسلی سی لی۔

آپ نے اسے میرے سپرد کیوں کیا؟"۔ سیّد صاحب بولے "اور کیوں

نہیں آپ نے مجھ پر اعتماد کیا۔ کیا میں آپ کا راز کبھی کسی سے کہہ دیتا۔؟"

"میں تو ابھی انتظار میں تھی صاحب کے دو سال اور اصل خیر سے گزریں تو میں منصور میاں سے سب کچھ کہہ دیتی۔ مگر انھیں خود چین نہ پڑا۔ یہ مجھے کھوجنے پہونچ گئے۔ اتنی بے ایمان، کمینی میں نہیں ہوں صاحب کہ پرایا۔۔۔ لاکھوں کا مال ہضم کر لیتی۔ میں ایسی نہیں ہوں صاحب!" انھوں نے بہت ناز دے سے برا مانا۔

منصور میاں۔ یہ ایاز صاحب کا اصلی نام ہے کیا؟" شکیب مسکرایا۔ ہاں نجمہ بی بی نے یہی نام رکھا تھا۔" میرن بی نے خشک لہجہ میں کہا۔" مجھے دینے لگیں تو کہا تھا اب آپ اسے ایاز کہہ کر پکارا کیجئے۔!

ذاست علی صاحب اب کہاں رہتے ہیں؟" رحمان صاحب نے پوچھا۔

"وہ اب کہاں۔ بیٹی کے نکاح کے دس بارہ روز جئے تھے پھر بے چارے گزر گئے۔!"

"خدا کی پناہ۔!" سیٹھ صاحب نے کہا۔" اور۔ وہ بیرسٹر صاحب جو نجمہ بی بی کے شوہر ہیں۔ یہ لوگ کہاں مقیم ہیں۔ اب تو ان حضرات سے ملنا بہت ضروری ہے۔ ان کا پتہ ہمیں بتا دیجئے۔!

"نجانے نجمہ بی بی اسے منظور کریں کہ نہ کریں۔" میرن بی بولیں" اب تو برسوں گزر چکے ہیں۔"

وہ منظور کریں کہ نہ کریں۔" دفعتہً ایاز کی بھرائی ہوئی آواز گونجی۔" میں اسے نامنظور کرتا ہوں۔ اگر میں ان کی آبرو کا درجہ

رکھتا ہوں تو خدا کی قسم۔ مجھے ان کی آبرو کی قسم کا پاس و لحاظ ہے۔ میں دل کو سمجھا لوں گا کہ مجھے جنم دینے والی ماں کبھی مر چکی ہے۔ اب میرے ماں باپ مجھے مل چکے ہیں! بس"

اور۔ وہ کھنکھار کر رحمٰن صاحب نے پوچھا: ان کے والد مصطفےٰ احمد صاحب تو بقید حیات ہوں گے۔ وہ کہاں ہیں۔ کچھ معلوم ہو تو بتایئے!"

"ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ دل شکستہ اور پریشان سے اپنی ایک پھوپھی کے پاس چلے گئے تھے۔ میرن بی نے مزید شجرہ سناتے ہوئے کہا" وہاں بھی بے چارے کو سکون نہ ملا۔ ان کے پھوپھا ریاض میاں، ایسے کم ظرف چھوٹے دل کے آدمی تھے کہ بیوی کے بھتیجے کو ایک آنکھ برداشت نہ کیا! بہت جھگڑے بکھیڑے کیے کہ لاکھوں کے آدمی ہیں اور خالی ہاتھ جھلاتے چلے آئے ہیں۔ کچھ لے کر آؤ۔ آخر مفت کا کب تک کھاؤ گے! سو ان طعنوں سے گھبرا کر وہ وہاں سے بھی چلے گئے۔ اب خدا جانے کہاں ہیں۔ ہیں بھی کہ نہیں۔!"

ہاجرہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا" میں بھی تو کہہ رہی تھی کہ یہ سارا قصہ کچھ ادھورا کچھ نامکمل میں نے سسرال میں سنا تھا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ صنوبیہ کے والد انہی ریاض صاحب کے بیٹے ہیں۔ توبہ۔ خدا بچائے۔ سارا خاندان ہی بزدلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ریاض صاحب کو خدا بخشے ایسے تھا کنجوس، چھوٹے ظرف کے آدمی تھے کہ کسی کو کھاتے پیتے دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ میرا گھر انہی باپ بیٹی نے مل کر اجاڑا ہے۔ جب دیکھو ریاض بیٹھے باپ اور بہن سے سرگوشیاں کرتے رہتے تھے!"

اب تو میرا دل چاہ رہا ہے کہ ہپ ہپ ہرے کا نعرہ لگاؤں۔ تیکیب

بولا: "یہ کیسے معلوم تھا؟ اجرہ آنٹی کے یہ موصوف آپ کے سسرالی رشتہ دار نکلیں گے۔ آپ کو اسی لیے ان سے اتنی محبت تھی شاید!"

خواب کی سی باتیں معلوم ہوتی ہیں:" سید صاحب بولے۔ پھر ایاز سے کہا: "میاں۔ تم جاؤ گے اپنی والدہ سے ملنے۔؟ یہ بہت ضروری ہے" والد صاحب کا پتہ بھی چلانا چاہیے۔ یہ بہت بری بات ہے کہ انکے والدین بقید حیات ہیں اور یہ اس طرح۔!" رحمان صاحب نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ایاز جو بے شمار جذبوں اور محسوسات میں چکرا رہا تھا وہ ان کی بات کاٹ کر بول اٹھا۔

"بڑے صاحب اور اماں مجھ سے تنگ آ چکے ہوں تو میں کہیں اور چلا جاؤں گا مگر یہ ناممکن ہے کہ میں ایسی بزدل ماں اور ایسے کمزور باپ کا پتہ چلاؤں اور ان کے پاس جاؤں کیا آپ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح بہت سے جھگڑے اور بکھیڑا ہو جائیں گے۔ والدہ صاحبہ کے موجودہ شوہر کو میرے وجود کا پتہ چل جائے گا وہ والدہ صاحبہ کو دھوکے باز اور فریبی سمجھیں گے۔ ان میں خانہ جنگی ہونے لگے گی آخر میرا وجود باعث ننگ تو نہ تھا پھر انھوں نے چھپایا کیوں۔ مطلب یہ کہ اس عمر میں بھی انھیں سکون نہ ملے۔ نہیں۔ اماں نہیں! مجھے ان زندہ مرحومین کی تلاش پر مجبور نہ کیجیے! اگر آپ سب نے زور دیا تو میں یہاں سے بھی کہیں اور چلا جاؤں گا!"

"میاں اپنی روپے پیسے والی کتابیں تو لے لو۔ میں ساتھ لائی ہوں" بسرت بی نے نہایت ایماندارانہ طریقے سے کہا۔ اس وقت ان کے چہرے پر دیوتی کا سا جلال و تقدس طاری ہو گیا تھا!

"اسے آگ لگا دیجئے۔ مجھے نہیں چاہیئے وہ روپیہ جس نے اتنا فساد پھیلایا وہ روپیہ جس نے سارے خاندان کو شرمناک کینسر میں مبتلا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ روپیہ۔ دے دیجئے کسی خیراتی ادارے یا یتیم خانے میں۔ میں اپنی اس حالت میں ٹھیک ہوں!" ایاز اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مگر میرن بی نے بہرحال اپنے بڑے سے کسنے سے پاس بک نکال کر سید صاحب کے پہلو میں رکھ ہی دی۔!

ہاجرہ آنٹی۔ سسرالی رشتے سے یہ آپ کے کون ہوئے؟" شکیب پھر ہنستا ہوا بولا۔

میاں یہ رشتے کے پھیر میری سمجھ میں نہیں آتے" ہاجرہ بولیں۔" بہرحال یہ میرا عزیز ہے۔ بس،

رات کے ڈھائی بجنے والے تھے۔ گدلے گدلے آسمان پر غبار آلود چاند اپنا سفر تمام کر رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں موگرے کے جھنڈ سے آتیں اور اپنا سارا عطر ان پر چھڑک کر چلی جاتیں۔

سب وہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اب ان کی کیفیت ہی جداگانہ تھی۔ ہر چہرہ پر مسکراہٹ تھی۔ فکر و تکدر کا کہیں نام نشان بھی نہ تھا۔ ایاز خود کو یوں ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے وجود پر گندگی لپیٹ دی تھی۔ اور وہ کسی آسمانی چشمے میں غوطے لگا کر آیا ہو۔ مگر پہلے کا سا خاموش سنجیدہ، اپنی بدلی ہوئی خانہ زاد بشن کا اسے مطلقاً کوئی احساس نہ

پھر ایک بوجھ سر سے اتار کر میرن خالہ نے بھی سکون و اطمینان کی تانی۔ بزرگ اپنی کھٹر پھٹر میں لگ گئے!۔ شکیب، ایاز، اور صنوبر یہ کو وہ رہتا لے گیا حوری بھی چائے لے کر پہنچ گئی!۔

شکیب کی موجودگی کا خیال کیے بغیر صنوبیہ ایاز سے بولی "سب سے زیادہ خوش بھی اگر میں ہوں تو سب سے زیادہ پشیمان بھی۔! خدا معلوم جبیر بھائی اور تم مجھے آپ سے اور کتنا برا بناتے! میری عقل ہی گم ہو گئی تھی۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو اتنی باتیں سنا دی تھیں۔ بعد کو میں اس قدر پچھتاتی تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا میں اپنی گستاخی اور بدزبانی کا مداوا کیونکر کر سکوں گی!" اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ "اب شکیب بھائی کو گواہ کر کے کہیے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے!"

"ارے۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں صنوبیہ بی بی" ایاز گھبرا کر بولا۔ "میں تو۔"

"انھوں نے معاف کیا ان کے خدا نے معاف کیا" شکیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

"آپ اپنی لنگڑی شاعری کو ادھر ہی رکھیے" حوری بگڑ گئی! پھر بولی "ارے میں تو بے حد خوش ہو رہی ہوں۔ اگر یہ اکھاڑ پچھاڑ ایاز بھیا کی زندگی میں نہ ہوتی تو آج انھیں سکون کیسے نصیب ہوتا۔ جو کچھ ہوا وہ بہت اچھا ہوا"

"ہاں۔ پروردگار جیسے ڈنک مارنے مکھیوں سے شہد مہیا کراتا ہے۔ اسی طرح۔ آج ان دشمنوں کی دشمنی سے ایاز صاحب۔ نہ تو یہ جناب منصور احمد صاحب کو کتنا بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ سچ ہے ؎

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ آگ لینے کو گئے پیغمبری مل گئی

سبحان اللہ۔!" شکیب نے بڑی عقیدت سے کہا۔ پھر انگڑائی لے کر جماہی لی "اب تو چلا سونے۔ ہائے مگر نیند کیا خاک آئے گی۔ تمہارے نام کا بارہ تیرہ لاکھ خواب میں آ کر پھڑ پھڑاتے رہیں گے۔ ہنھ! بارہ لاکھ۔ یہاں بارہ سو بھی گرہ میں نہیں! کیا قسمت ہے!۔

"لالچی۔ ندیدے!" حوری بولی۔

شکیب بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اور اس کے پیچھے حوری بھی لپک گئی!۔

"صنوبیہ بی بی۔ میں آپ کے گھر سے جا کے بہت پشیمان ہوا تھا" ایاز نے کہا "تنہائی سے فائدہ اٹھانے اور رومانی بکواس کرنے سے وہ دونوں ہی بلند تھے"۔ "اگر آپ نے کچھ کہا بھی تھا تو میں نے اتنا اثر کیوں لیا۔؟

"اب یہ بتائیے کہ آپ نے مجھے احمق سمجھ کے میری باتیں دل سے دور کر دیں کہ نہیں" صنوبیہ بولی۔

"ارے۔ بار بار اس کا تذکرہ نہ کیجئے۔!" وہ کھسیا کر ہنسا۔

"آپ صبح کو ہمارے ساتھ چلیں گے نا" صنوبیہ بولی "یا اگر شکیب بھائی نے جانے نہ دیا"

اچانک شکیب چائے کی ٹرے لیے پھر کمرے میں گھس آیا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔" صنوبیہ بی بی۔ شکیب بھائی دو کبابوں کے بیچ ہڈی نہیں بنیں گے۔ آپ اطمینان رکھیئے۔!" ٹرے میز پر رکھ کر اس نے پھر شعر عرض کر دیا ؎

"تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر۔ اور۔ !"

"شکیب بھائی آپ ایسے بے موقعہ مصرع مت پڑھا کیجئے!" صنوبیہ ہنستی ہوئی بولی "بھلا بتائیے۔ اس مصرعہ کا یہاں کیا تک تھا!۔"

"تک یہ تھا۔!" چائے کا ایک لمبا سا گھونٹ سڑپ کر شکیب نے آنکھیں نکالیں "کہ آپ جتنے بھی خفگی کے ردّے رکھیے یہ اپنی گردن پر رکھ لے گا۔ آپ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔ جو جی چاہے اس کے ساتھ کیجئے تو اسے میں نے تربیت دے کر بے حد سعادت مند بنا دیا ہے۔ آپ اسے قتل بھی کر دیں گی تو اُف نہ کرے گا۔ مطلب یہ کہ منصور نام کی مناسبت سے دار یعنی سولی عمر قید۔ اب بھی نہیں سمجھیں؟؟"

"بیٹھئے آپ فضول بکواس کرتے ہیں" صنوبیہ گلابی ہو گئی! اور ایاز ہنسنے لگا!۔ مگر وہ مطمئن تھا کہ اس کے سارے خوابوں کی تعبیر مل چکی تھی۔!

ختم شد